ہماری ویب ای بُک

سید مسرت علی

SYED MUSARRAT ALI

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

HAMARI WEB .com

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Syed Musarrat Ali"
at Hamariweb.com

اشرف المخلوقات

ابھی تک تو یہی معلوم ہوا ہے کہ کائنات بنانے والے نے اس کرّہِ ارض یعنی زمین پر انسان کو سب سے افضل یعنی بہترین مخلوق بنایا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جس قدر اس مخلوق نے اس سیّارے کی خوبصورتی کو برباد کیا شاید ہی کسی اور مخلوق نے کیا ہو۔ چلیں سیّارے کی خوبصورتی برباد کرنے کی ہزاروں دلیلیں ہونگی لیکن دُکھ اس بات کا ہے کہ اس اشرف مخلوق نے اپنی ہم جنس مخلوق کو جتنا برباد کیا اُس درجہ کی بربادی کسی اور مخلوق نے کی ہو میرے علم میں نہیں۔ میرے ذہن میں جب بچپن میں سنا ہوا مقولہ "بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے" آتا ہے تو اس کو حضرتِ انسان پر منطبق کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو ایک کمزور سی دلیل ملتی ہے کہ شاید انسان مچھلی کی نسل سے ہو لیکن ایک دلیل تو فوراً ہی اس کی نفی کر دیتی ہے کہ مچھلی بے چاری پانی سے باہر آتے ہی مر جاتی ہے اس لئے مجبوراً پانی میں ہی رہ کر اپنے زندہ رہنے کا سامان کرنا ہے لہٰذا اپنی ہم جنس کو نہ کھائے تو کیا کرے؟

انسان جب جنگلوں میں جانوروں کی طرح رہتا تھا تب بھی اپنے ہم جنس کا شکار نہیں کرتا تھا حالانکہ دنیا پہ مکمل حکمرانی کیلئے مطلوبہ تین قوتوں (جسمانی

ذہنی اور مالی) میں سے محض ایک ہی یعنی جسمانی قوت ہوتی تھی اور معمولی سی ذہنی ، جس کے بل بوتے پر وُہ زندہ رہنے کیلئے جانوروں کا شکار کیا کرتا تھا۔ ان ہی دو قوتوں کے استعمال سے جبلّتی خواہشِ حکمرانی پوری کرنے کیلئے قبیلہ کا سردار بن جاتا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ یہ جنگلی انسان تہذیب یافتہ ہوتا گیا۔ جسمانی، ذہنی اور مالی قوت و حیثیت میں اضافہ کرنے کی لگن ہَوس میں تبدیل ہونے لگی۔ جسمانی و ذہنی قوتیں تو ایک محدود حد تک بڑھائی جا سکتی تھیں لیکن اِن دونوں کے یکجا استعمال کے ذریعے مالی قوت میں لامحدود اضافہ کا فَن اس کی سمجھ میں آگیا اور یوں لا محدود مالی قوت کے جائز و نا جائز استعمال کے ذریعے پورے کرہِ ارض پر حکمرانی کے شوق نے جنگلی قبیلہ کے سردار سے بھی بد نما انسان بنا دیا بلکہ مندرجہ بالا تینوں طاقتوں سے مزیّن مخلوق انسان کی شکل میں "بے حِس حیوان" بن گئی اور اس حیوان کے کارناموں کی درج ذیل مختلف اشکال ہیں :-

1. دنیا کے امیر ترین ایک فیصد افراد کے پاس باقی دنیا کی مجموعی آبادی سے بھی زیادہ دولت ہے۔ یہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ اسی ماہ یعنی جولائی 2013 کی اقوام متحدہ کی شائع شدہ رپورٹ کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا کی کل رقم مجموعی طور پر 223 کھرب ڈالرز ہے، دنیا کی اکثریت کے پاس اپنے بچوں کو

بنیادی تعلیم دلوانے اور ادویات لینے کے بھی پیسے نہیں ہیں جبکہ امیر ترین افراد نے دنیا کی کل رقم کا 43 فیصد دبوچ رکھا ہے، باقی 80 فیصد آبادی کے پاس دنیا کی کل رقم کا صرف 6 فیصد حصہ ہے۔ یوں دنیا کے 300 افراد کے پاس باقی 3 ارب غریب ترین لوگوں سے بھی زیادہ پیسے ہیں، دنیا کے امیر ترین ممالک ہر سال غریب ممالک کو 130 ارب ڈالرز امداد کی صورت میں دیتے ہیں لیکن اس کے بدلے میں بڑی بڑی کمپنیاں غریب ممالک سے 900 بلین ڈالرز مہنگی اشیاء بیچ کر کھینچتی ہیں۔ دوسری جانب غریب ممالک ہر سال 600 ارب ڈالرز لی جانے والی امداد پر سود کی صورت میں امیر ممالک کو دیتے ہیں، کل ملا کر دنیا کے غریب ترین ممالک پہلے سے ہی امیر ممالک کو 2 کھرب ڈالرز ہر سال دیتے ہیں۔ امیر اور ترقی یافتہ ممالک دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ غریب ممالک میں ترقی کے خواہشمند ہیں اور اس لئے ان کو ساتھ لے کر چلیں گے لیکن اگر دیکھا جائے تو معاملہ الٹ ہے۔

مائیکل اسٹائنڈر کے انفارمیشن کلیئرنگ ہاؤس کے آرٹیکل بتاریخ 31 جنوری 2.2013
دنیا کو کون چلا رہا ہے" کے مطابق 1922 میں نیویارک سٹی کے میئر "
-: جان۔ایف۔ہائلین نے اپنی تقریر میں کہا تھا
ہماری ری پبلک کے لئے سب سے بڑا خطرہ وہ نہ نظر آنے والی حکومت ہے جو ایک "
دیو قامت آکٹوپس کی طرح اپنی کیچڑ آلود ٹانگیں بے پرواہی کے ساتھ ہمارے

شہروں، ریاستوں اور حتّٰی کہ پوری قوم پر پھیلا رہی ہے۔ اور اس آکٹوپس کا سَر راکفیلر اسٹینڈرڈ آئل اور ایک چھوٹا مگر بہت طاقتور بین الاقوامی بینکنگ گروپ ہے۔ اور یہ گروہ اپنے مفادات کی خاطر عملی طور پر امریکہ کی حکومت چلا رہا ہے۔ درج ذیل نامی گرامی 25 بینک اور کارپوریشنز ہیں جو اس جتھے میں شامل ہیں :

1. Barclays plc

2. Capital Group Companies Inc

3. FMR Corporation

4. AXA

5. State Street Corporation

6. JP Morgan Chase & Co

7. Legal & General Group plc

8. Vanguard Group Inc

9. UBS AG

10. Merrill Lynch & Co Inc

11. Wellington Management Co LLP

12. Deutsche Bank AG

13. Franklin Resources Inc

14. Credit Suisse Group

15. Walton Enterprises LLC

16. Bank of New York Mellon Corp

17. Natixis

18. Goldman Sachs Group Inc

19. T Rowe Price Group Inc

20. Legg Mason Inc

21. Morgan Stanley

22. Mitsubishi UFJ Financial Group Inc

23. Northern Trust Corporation

24. Société Générale

25. Bank of America Corporation

یہ لا محدود سرمائے کے مالک میرے اور آپکی طرح اپنا سرمایہ مقامی بینکوں میں نہیں Cayman رکھتے بلکہ اُن بینکوں میں رکھتے ہیں جہاں اس پر ٹیکس نہیں لگتا مثلاً Islands۔ پچھلے سال گرمیوں میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق اس گلوبل اشرافیہ کے 32 ٹریلین ڈالرز دنیا کے مختلف آف شور بینکوں میں محفوظ ہیں۔ اس نئے جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے باقی ہم سب بشمول ہماری

حکومتوں کے ان کے مقروض غلام ہیں۔

سیّد مسرّت علی

سینئر انسٹرکٹر ریٹائرڈ

منیجمنٹ ٹریننگ پی آئی آے

جولائی 22 2013

"توجّہ ہٹاؤ نوٹس"

پوری دنیا میں محض دو ممالک ایسے ہیں جن کے عوام ہمیشہ اپنی اور اپنے ملک کی منفی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان میں ایک پاکستان ہے اور دوسرا انڈیا لیکن پاکستان پہلے نمبر پر ہے۔ حقیقت کو تسلیم کرنا بہت مشکل کام ہے کیونکہ میں خود ایک پاکستانی ہوں اور بچپن سے دیکھ رہا ہوں کہ جہاں کہیں ایک سے زائد پاکستانی نظر آیا اور حکمرانوں کو صلواتیں سنانا شروع کیں۔ میں اس کارِ خیر میں پوری طرح شریک ہوں اور آسٹریلیا و انٹارٹیکا کے علاوہ پاکستان کے اندر یا باہر کوئی شہر ایسا نہیں جہاں ہم پاکستانی یہ تبرّانہ بھیج رہے ہوں۔ جناب مستنصر حسین تارڑ صاحب نہایت شریف النفس انسان ہیں جنہوں نے اپنے سفرناموں میں اس کا ذکر نہیں کیا کیونکہ اُن کا مقصد دنیا کے بارے میں معلومات و تفریح مہیا کرنا تھا نہ کہ اپنے چاہنے والوں کو رنجیدہ کرنا۔ میں یہ مضمون اس منفی سوچ کے بارے میں لکھ کر قارئین کی معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہیں کرونگا بلکہ اس کی بے شمار وجوہات میں سے محض ایک وجہ بیان کرونگا اور وہ ہے میرے مضمون کا عنوان یعنی " توجہ ہٹاؤ نوٹس"۔

یہ نوٹس پارلیمنٹ میں "توجہ دلاؤ نوٹس " کے ردّ عمل کے نتیجہ میں معرضِ

وجود میں آیا۔ کالج میں طالب علمی کے زمانہ میں سیاست میں بھی داخلہ لے لیا کیونکہ پڑھائی ' اسپورٹس' اسکاؤٹنگ کے علاوہ یہی ایک مضمون رہ گیا تھا جس کی جانب میرے عظیم کلاس فیلو شیخ رشید نے توجہ دلائی جس کے باعث ہم نے سب سے پہلے تو اُس ہی کو اسٹوڈنٹس یونین کا صدر بنا دیا۔ آگے چل کر ایک دن ایسا آیا کہ اُس ہی سے دریافت کرنا پڑا کہ یہ "توجہ دلاؤ نوٹس" کیا ہوتا ہے۔ اُس نے تو خوب اچھی طرح سمجھا دیا اُس کی قابلیت اور شعلہ بیانی کو کون نہیں جانتا۔ مزید آگے سیاست میں تھوڑا اُوپر جانے کے ساتھ ساتھ معلومات میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور آج نہ صرف یہ کہ "توجہ دلاؤ نوٹس" کے بارے میں اچھی طرح علم ہے بلکہ " توجہ ہٹاؤ نوٹس" کے بارے میں بھی ایک مکمل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

توجہ ہٹاؤ نوٹس" کی تشریح کچھ اس طرح ہے کہ جب چینی چار آنے مہنگی ہوئی اور " ملک میں تاریخ کا پہلا پہیّہ جام ہوا تو مرحوم ایوب خان کے مشیروں نے مشورہ دیا کہ انڈیا سے ایک مرتبہ پھر جنگ کا اعلان کر دو ساری قوم کی توجہ چینی سے ہٹ جائیگی اور تمھاری حکمرانی کو مزید دس سال کی مہلت مل جائیگی۔ ایوب خان نے کہا میں نے حالات بہتر کرنے کیلیے مارشل لاء لگایا تھا اور عزّت بھی کوئی شے ہوتی ہے۔ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف جب نو ستاروں کی جانب سے تحریک کے دوران کافر ہونے کا فتویٰ صادر ہوا تو اس کے مشیروں نے بھی

انڈیا پر چڑھائی کا مشورہ دے کر "توجہ ہٹاؤ نوٹس" والا فارمولہ استعمال کرنے کا کہا لیکن ابھی تھوڑی شرافتِ انسانیت باقی تھی للذا اس نے سُولی پر چڑھنے کو ترجیح دی۔

رفتہ رفتہ شرافت ناپید ہوتی چلی گئی اور " توجہ ہٹاؤ نوٹس" کا بے دریغ استعمال ہوتا چلا گیا اِسی لیے آج ہر آدھے گھنٹے میں کم از کم ٹی وی کی پچاس چینلز پر مختلف بریکنگ نیوز توجہ ہٹاؤ نوٹس" کی مانند چل رہی ہیں اور ہم پاکستانی عوام بیچارے کیا کیا یاد رکھیں " اور ویسے بھی وہ شخص جس کا بیٹا' بہو اور پوتا گاڑی میں بیٹھے ایک خود ساختہ سیلابی ریلے میں بہہ جانے کے واقع کو بھول کر درج ذیل " توجہ ہٹاؤ نوٹس" بریکنگ نیوز کیسے سمجھ سکتا ہے:-

1. مشرف کی کونسی پیشی ہے؟
2. ٹرین کی پٹری کس نے اُڑائی؟
3. بلوچستان سے پنجاب جانے والی بس سے مسافروں کو اتار کر کس نے مارا؟
4. کراچی شہر کے ڈیفنس' کلفٹن' گلشن اقبال اور لیاری میں دھماکے کس نے کیے؟
5. صدر زرداری نے ایران کے صدر کی حلف برداری میں کتنے کمیشن کی بات کی؟
6. وزیر اعظم نواز شریف نے لیلتہ القدر میں اللہ تعالی سے پاکستانی عوام کیلیے کتنی لوڈ شیڈنگ مانگی؟

7. کتنے آدمی آئے اور کتنے ساتھ لے گئے ڈی آئی خان جیل سے؟

8. عمران خان یہودی ایجنٹ ہیں یا فضل الرحمٰن شرابی؟

9. کمانڈو کتنے آ رہے ہیں ٹریننگ دینگے یا؟ Seal امریکن

10. چلاس میں سکیوریٹی اہلکاروں کو کس نے مارا؟

کسی کو یاد ہے کہ تین روز پہلے سعدی ٹاؤن کراچی میں معمولی بارش سے آنے والے سیلاب سے تباہی کا کیا ہوا اگر نہیں تو 2010 میں آنے والے سیلاب اور 2005 میں آنے والے زلزلہ سے تباہی کا کیا خاک یاد ہو گا؟

اس کو کہتے ہیں " توجہ ہٹاؤ نوٹس" ۔ اسی لیے ایک سے زائد پاکستانی جہاں ہو گا اپنے حکمرانوں کو صلواتیں نہیں سنائے گا تو کیا قصیدے پڑھے گا؟

چیف جسٹس سپریم کورٹ سے اپیل

الیکٹرونک میڈیا کے لگ بھگ پچاس نیوز چینلز کے رپورٹرز اور کیمرہ مین تین دن سے ضمنی انتخاب کے امیدواروں اور ان کے ووٹروں کے گھر سے لیکر بیلٹ باکس کے اندر تک گھسے جا رہے ہیں اور اس چکر میں انٹرٹینمنٹ نیوز کے نام پر بالی ووڈ کی عریانیت سے بھی عوام کو مرحوم کر دیا ہے۔آج تو سارا دن ہر چینل پر یہ بریکنگ نیوز چلتی رہیں :-

1. ہماری چینل نے سب سے پہلے فلانے حلقے کا غیر سرکاری نتیجے کا اعلان کیا اور یوں ہم پہلے نمبر پر رہے۔

2. ہماری چینل نے سب سے پہلے فلانے حلقے کا غیر سرکاری حتمی نتیجے کا اعلان کیا اور یوں ہم پہلے نمبر پر رہے۔

3. ہماری چینل نے سب سے پہلے فلانے حلقے کا سرکاری نتیجے کا اعلان کیا اور یوں ہم پھر باری لے گئے۔

4. ہماری چینل نے سب سے پہلے فلانے حلقے کا سرکاری حتمی نتیجے کا اعلان کیا اور یوں ہمیشہ کی طرح اپنا ریکارڈ قائم رکھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب پچاس مختلف بریکنگ نیوز لکھنا ایک آرٹیکل میں ممکن نہیں۔ کیا الیکشن کمیشن بیلٹ باکس اٹھا اٹھا کر تھک کر سو گیا؟ میری جناب چیف جسٹس سپریم

کورٹ آف پاکستان سے درخواست ہے کہ وہ ان میڈیا کی خبروں کا از خود نوٹس لیں جو کہ وہ عام طور سے لیتے ہیں اور ان سے کہیں کہ یہ بڑے بڑے مافیا گروپس (میڈیا گروپس) ذرا 2010 سے پانی میں ڈوبے ہوئے غریبوں کی حالتِ زار دکھانے میں بھی بازی لے جانے کی کوشش کریں۔ ان نیوز چینلز پر ہیڈلائنز میں دنیا کا سب سے بڑا پاکستان کا جھنڈا' دنیا کا سب سے اونچا فوارہ پاکستان میں' ایشیاء کا سب سے بڑا پارک کراچی میں دکھایا جاتا ہے۔ ڈاگٹ شوز میں بتایا جاتا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے سونے' تانبے' کوئلے' ہیرے جواہرات' تیل و گیس کے ذخائر پاکستان میں موجود ہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا "کالا باغ" ڈیم بنا سکتے ہیں لیکن بنائیں گے نہیں ورنہ ہمارے پڑوسی کے ہاں قحط پڑ جائیگا۔ پہلے ہی ڈکٹیٹروں نے دو ڈیم "منگلہ و تربیلہ" بنا کر ہمیں مشکل میں ڈال دیا ہے۔ حکومت کو نہ تو کوئی نیشنل اسکیوریٹی کونسل بنانے کی ضرورت ہے اور نہ ہی پورے ملک میں کلوز سرکٹ ٹی وی کیمرے لگانے کی ضرورت ہے کیونکہ "سرِعام"، "پُکار"، "Raid"، "کریمنل موسٹ وانٹڈ"، "جیو ایف آئی آر"، "شکنجہ اسرار" جیسی ایجنسیاں اور ان کے کیمرے ملک کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں ان سے بھلا کوئی دہشت گرد تو کیا اُن کے مُنہ کے دانت اور کان کا میل بھی نہیں بچ سکتا۔ چونکہ یہ تاریخ کے سب سے بڑے ضمنی انتخاب کا معاملہ ہے اس لیئے آخری مرتبہ چیف جسٹس صاحب سے گزارش کر رہا ہوں اس کے بعد تو مارننگ شوز کی لائیو

عدالتیں ماشااللہ روزآنہ کی بنیاد پر ہر قسم کے کیسس نمٹانے لگی ہیں عدالتی نظام وہ سنبھال لیں گی۔

بی بی سی اور سی این این بھی نیوز چینلز ہیں۔ جھوٹ بھی اتنے سلیقے سے نشر کرتے ہیں کہ سچ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ہر روز دنیا کے کسی ایک ملک کے بارے میں ایک گھنٹے کی رپورٹ میں ثابت کر دیتے ہیں کے یہ ملک اگر ہمارے مشورے پر نہ چلا تو تباہ ہو جائیگا اور یوں روزِ اوّل سے دنیا پہ حکمرانی کے ایجنڈے پر تسلسل سے قائم ہیں۔ کامیابی یا ناکامی اللہ کے ہاتھ میں ہے کیونکہ اللہ اُن کا بھی ہے۔

نوٹ: پہلا پیراگراف لکھنے کے دوران معمولی سا ہارٹ اٹیک ہوُا جس کی وجہ سے مکمل کرنے میں تاخیر ہوئی۔

کامران خان کی دو خوشخبریاں

کل رات کامران خان شو میں کامران صاحب نے ہمیں دو خوشخبریاں سنائیں ایک تو امریکہ کی ایک اہم رپورٹ سے انھیں پتہ چلا کہ پاکستان میں آئل اور گیس کے بیش بہا خزانے موجود ہیں کیونکہ ہماری حکومتی مشینری بشمول او۔جی۔ڈی۔سی۔ایل (OGDCL) سب سو رہے ہیں خیر یہ تو معمول کی بات ہے لیکن حیرت ہے کہ ہمارا چاق و چوبند چھاپہ مار میڈیا بھی سو رہا ہے لہٰذا ہمیں امریکہ سے یہ پتہ چلا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے:-

OGDCL

Facts & Figures

Established in 1961

Converted into Public Limited Company October 1997

Major Activities

Exploration & Development of Oil & Gas Resources

Exploratory

Appraisal Wells & Development Wells: 287

379

Discoveries (up to 31-07-2013) 97

Major Oil & Gas Fields

Chanda

Thora

Pasakhi

Chak Nurang

Fimkasar

Nandpur Panjpir

Uch

Daru Tando Alam

Sono

Lashari

Dakhni

Sadkal

Rajian,

Missa Kiswal

Pirkoh Kunnar

Bobi

Kal

Dhodak

Missan

Loti

Mela

Qadirpur

Net Sales for FY2011-12 Rs. 197.839 Billion

Profit After Tax for FY2011-12 Rs. 96.906 Billion

Net Sales for FY2010-11 Rs. 155.63 Billion

Profit After Tax for FY2010-11 Rs. 63.53 Billion

اگر یقین نہ آئے تو برائے مہربانی یہ لنک کلک کریں

http://wwww.ogdcl.com/

دوسری خوشخبری بھتہ خوروں اور ٹارگٹ کلرز کیلئے تھی کہ بھائی اپنا ساز و سامان قبرستانوں اور پانی کی ٹنکیوں میں چھپا کر تھوڑے دن کیلئے کراچی سے باہر چھٹیوں پر چلے جاؤ فوج چلی جائے تو پھر آ جانا۔ حالانکہ ہمارے وزیر داخلہ جناب چوہدری نثار احمد خان صاحب روزآنہ پریس کانفرنس کر کرکے ان سے پوچھ رہے ہیں کہ بھائی میں آ جاؤں؟ اور وہ ہیں کہ صحیح طریقے سے جواب ہی نہیں دے رہے۔ اور تو اور اللہ نظرِ بد سے بچائے ہمارے نیوز چینلز کو جو صبح دوپہر شام بریکنگ نیوز میں چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں " کراچی میں فوج آ رہی ہے چھپ جاؤ" مگر وہ لوگ تو نیٹو کی فوج سمجھ کر آرام سے پرچیاں بمع گولی

بانٹتے پھر رہے ہیں۔
چیف جسٹس صاحب تیسری مرتبہ یہ کہنے آئے ہیں کہ سیاسی جماعتیں ان بھتہ خوروں اور ٹارگٹ کلرز کو اپنے پروں میں چھپالیں اُن کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب آپ ہی بتایئے کراچی میں امن کیسے قائم ہوگا؟
اچھا پولنگ کر لیتے ہیں کہ فوج آئے یا نہ آئے۔ ہاں کیلئے 1 اور نہ کیلئے 2 لکھ کر "جیو تیز پر ایس ایم ایس کردیں مگر جلدی سے کیونکہ فیصلہ تو "جیو تیز" کو ہی کرنا ہے۔ "

تین نظام

ازل سے تین نظام چل رہے ہیں:

ایک وہ نظام جو ہمارے اختیار میں ہے اُس کی منصوبہ بندی ہم کرتے ہیں اور اس کے نتائج بھی عین ہماری مرضی کے مطابق حاصل ہوتے ہیں۔

دوسرا وہ جو ہمارے اختیار میں ہے اُس کی منصوبہ بندی ہم کرتے ہیں لیکن اس کے نتائج ہماری مرضی کے مطابق حاصل نہیں ہوتے۔

تیسرا وہ جو ہمارے اختیار میں تو تُھا، ہم اُس کی منصوبہ بندی بھی نہیں کرتے اور اُس کے نتائج سے بھی لاعلم ہوتے ہیں کیونکہ جب ہم نے منصوبہ بندی ہی نہیں کی تو اُس کے نتیجہ کا ہمیں کیا اندازہ؟

تینوں طرح کے نظام پر بحث ہوئی ہے اور مزید ہو سکتی ہے لیکن میں آج محض دوسرے نمبر والے نظام پر اپنی رائے کا اظہار کرونگا۔ ممکن ہے بیشتر قارئین اتفاق نہ کریں لیکن یہ ان کا بنیادی حق ہے۔ بیشتر ترقی یافتہ ممالک ستاروں پر کمندیں ڈال چکے ہیں، محض دو لاکھ ڈالر کا وَرجن اٹلانٹک کے اسپیس شپ کا ٹکٹ لے کر خلا کی سیر کی بکنگ زور و شور سے جاری ہے لیکن سمندروں میں چلنے والے ست رفتار کارگو شِپس کا آج بھی کوئی نعم البدل نہیں لہٰذا بندرگاہوں

کی قدر و منزلت میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ایسے ممالک جن کی سرحدوں کے ساتھ سمندر واقع ہیں وہاں بندرگاہیں بھی ہیں اور وہ خوش نصیب سمجھے جاتے ہیں۔ پاکستان کے جنوب میں بحیرہ عرب واقع ہونے کی وجہ سے اس میں تین بندرگاہیں کراچی، پورٹ قاسم اور گوادر موجود ہیں۔ جیسے ہوائی جہازوں کیلئے کم از فاصلہ پر ائرپورٹ درکار ہوتے ہیں اسی طرح بحری جہازوں کیلئے بھی کم از کم فاصلہ پر بندرگاہیں درکار ہوتی ہیں تاکہ کسی ناگہانی کی صورت میں جلد از کنارے پہنچا جاسکے۔ منزلِ مقصود تک پہنچنے کا فاصلہ ہر قسم کی سواری کیلئے کم از کم ہونا لازمی جزو ہے تاکہ سفری اخراجات کم از کم ہوں۔

مندرجہ بالا شرائط اور حدود و قیود کی روشنی میں گوادر پورٹ کی اہمیت اسقدر شدت سے محسوس کی جاتی ہے جس کو ہمارے علاوہ دنیا کے تمام ممالک تن، من، دھن کی بازیاں پچھلی پانچ دھائیوں سے زائد سے محض اس لیئے لگا رہے ہیں کہ وہ کسی طرح اس کو حاصل کرکے اپنی تجارت کو فروغ دے سکیں۔ یاد رہے گوادر 3 ملین ڈالر میں 8 ستمبر 1958 کو اومان سے خریدا گیا تھا۔ سوویٹ یونین نے گوادر تک پہنچنے کیلئے دسمبر سے فروری 1989 تک نو سال افغانستان میں جنگ لڑی اور وہیں سے 1979 نامراد لوٹنا پڑا۔ اس جنگ میں امریکا ہمارے ساتھ تھا کیونکہ روس کے بعد اس کا نمبر تھا اور 9/11 کا بہانہ بنا کر آج تک اس امید پر ہزاروں اپنے فوجی، ہزاروں ہمارے اور بے شمار اسلحہ ضائع کرنے کے باوجود

اِسکوائر وَن پر کھڑا ہے۔

اس کے برعکس چین نے کوئی جنگ نہیں کی۔ تدبّر، فہم و فراست سے کام لیا، ظلم و زیادتی کے باوجود صبر کا دامن نہیں چھوڑا اور یہی وجہ ہے کہ ہم گوادر کیا پورا پاکستان اس کی جھولی میں ڈالنے کیلئے بے چین ہیں۔ حضرت محمّد ﷺ کے چچا سعد ابن ابی وقاص، جعفر ابن ابی طالب اور جاہش ابیسینیا سے چٹاگانگ۔ کامرپ۔ منی پور کے راستے 16/615 میں بحری راستے سے پہلی مرتبہ چین گئے اس کے بعد حضرت عثمانؓ کے حکم پر تیسری مرتبہ 51/650 میں سعد ابن ابی وقاص چین میں سفارتخانہ کھولنے کی غرض سے تشریف لے گئے جہاں بادشاہ نے بہت گرم جوشی سے استقبال کیا اور کینٹن شہر میں چین کی پہلی مسجد حضرت محمّد ﷺ کی یادگار کی حیثیت سے بنانے کا حکم دیا۔ عرب میں اسلام کے دور سے پہلے سے عرب اور چین کے درمیان تجارتی تعلقات تھے لیکن یہ چین کے جنوبی ساحل کے ذریعے ہوتے تھے جو کہ بہت طویل سفر ہؤا کرتا تھا لہٰذا اس کو کم کرنے کی ضرورت اس وقت سے ہی محسوس کی جاتی تھی۔

دوسرا نظام دیکھیئے کہ منصوبہ بندی اور تگ و دو کن ممالک نے کی اور آج تاریخ نے فیصلہ کس کے حق میں دیا۔ اسی لئے تو حضرت محمّد ﷺ نے فرمایا تھا کہ سیکھنا ہے تو چین سے سیکھو۔

دشمنِ اسلام

آستینوں میں چھپے سانپ بھی مارے جا سکتے ہیں اور بغلوں میں چھپے بُتوں کو گرانے کیلئے رفع یدین کا حکم بھی دیا جا سکتا ہے لیکن دلوں میں بسی اسلام دشمنی کا توڑ آج تک دریافت نہ ہو سکا۔ یہ اسلام دشمن غیر مسلم ہر گز نہیں بلکہ خود اسلام کے نام نہاد پیروکار ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے کسی ایک کا نام لیں جس نے اسلام کا پیغام نہ دیا ہو تو بھلا ان تمام پیغمبروں کے پیروکار غیر مسلم کیسے ہو سکتے ہیں؟ دوسری بات یہ کہ حضرت محمدﷺ نے کبھی کسی پیغمبر کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ ان کی تعلیمات غلط تھیں تو پھر پیروکار غلط یا بُرے کیسے ہو سکتے ہیں؟

مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اسلام کے ٹھیکیدار بہت بے تاب ہونگے یہ فرمانے کیلئے کہ ہم کب یہ کہہ رہے ہیں ہم تو یہ کہہ رہے ہیں کہ انھوں نے اپنے پیغمبروں کی تعلیمات میں تبدیلیاں کر دیں اور کوئی ایک بھی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں، ہاں ہم اصلی کتابوں کو مانتے ہیں۔ میں کوئی نیا انکشاف کر کے دنیا کو حیرت زدہ کرنے کے قابل نہیں لیکن اپنے دل میں پیوستہ اسلام دشمنی کی پھانس نکالنے کی سعیِ ناکام کرنا چاہتا ہوں جو کہ دو مرتبہ اوپن

ہارٹ سرجری کے باوجود نہ نکل سکی۔

پیدائش کے وقت کان میں اذان دی گئی اورجب سے ہوش کی سیڑھی پر قدم رکھا آج تک یہی سنتا چلا آ رہا ہوں کہ قران شریف دنیا کی واحد کتاب ہے جو اصلی حالت میں موجود ہے اور یہی وہ واحد کتاب ہے جو لفظ بہ لفظ زبانی یاد یعنی حفظ ہو جاتی ہے للذا اگر کوئی ایک لفظ بھی تبدیل کرنے کی کوشش کرے تو وہ فوراً پکڑا جائیگا۔ سبحان اللہ !

اب ذرا کمالِ فن دیکھیئے اس کے پیروکاروں کا کہ یہ واحد اُمّت ہے جو سو سے زائد فرقوں میں بٹ چکی ہے چلئے اختلاف رائے کوئی بری بات نہیں لیکن اختلاف رائے کی بنیاد پر دائرہ اسلام سے خارج کرنا تو پہلی وارننگ ہے اور دوسری وارننگ ہے قتل کیونکہ واجب القتل کی دفعہ پہلی وارننگ میں پوشیدہ ہے۔ سبحان اللہ !

مجھے کوئی امّتِ مسلمہ کی تعریف بتادے۔ میں نے تو بچپن سے سن رکھا ہے کہ یہ وہ واحد امّت ہے جو ایک جسم کی مانند ہے کہ جسم کے کسی حصّہ میں تکلیف ہو تو پورا جسم نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ ردِّ عمل کا بھی اظہار کرتا ہے۔ سبحان اللہ ! پانچ سال کی عمر میں میرے ماموں جمعہ کی نماز گاؤں کی جامع

مسجد میں پڑھانے لے گئے نماز کے بعد ایسی رقّت آمیز دعا مانگی گئی کہ میں رو پڑا اور باہر نکل کر ماموں سے پوچھا کی یہ کشمیر اور فلسطین کونسے گاؤں ہیں اور یہاں سے کتنی دور ہیں؟ انھوں نے پوچھا کیوں بیٹا کیا بات ہے؟ میں نے کہا میں اپنے حصے کا رات کا کھانا دیکر آؤنگا، ماموں بھی جذباتی ہو گئے کیونکہ حافظِ قران تھے۔ سبحان اللہ! اِن ہی ماموں نے بتایا تھا کہ قبلہ کی جانب پاؤں کرکے نہیں لیٹتے۔ 1986 میں عمرہ کیلئے گیا تو حرم شریف کے اندر بے شمار لوگوں کو خانہ کعبہ کی جانب پاؤں کیئے خراٹے لیتے دیکھا اس کے بعد کراچی میں مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے گلے کٹتے دیکھے، ایران و عراق جنگ، عراق و کویت فساد، افریقن مسلم ممالک میں "کل انمالمومنون اخوہ" کا بہیمانہ قتلِ عام اور اب عرب اسپرنگ نامی نیا میدانِ جنگ جس کا ڈراپ سین کچھ اس طرح ہونے والا ہے کہ خادمین حرمین شریفین نے اپنے آقا امریکہ سے فرمایا ہے کہ آپ یونائٹڈ نیشن تو کیا دنیا کی پرواہ نہ کریں اور ملکِ شام کو نیست و نابود کردیں تمام اخراجات ہم برداشت کریں گے کیونکہ وہ ہمارے حساب سے اسلام کے دائرے میں نہیں آتے۔ سبحان اللہ!

اسکے بعد بھی ہمارے اس عہد کے جیّد اسلامی اسکالر چوبیس گھنٹے راگ الاپتے ہیں کہ ہمارا مذہب اسلام سب سے اچھا ہے اور قارئین، سامعین و ناظرین کو اس پر عمل کرنا چاہیئے ہمارا کام سمجھانا ہے عمل کرنا نہیں۔ سبحان اللہ!

حالانکہ حضرت محمد ﷺ نے یہ کہہ کر کبھی کسی مذہب کی توہین نہیں کی بلکہ واحد اللہ اور اس کی واحد کتاب کا نمونہ بن کر دشمنانِ اسلام کو راہِ راست کی جانب راغب کیا۔
اب آپ ہی فیصلہ کریں دشمنِ اسلام کافر ہیں یا نام نہاد مسلمان؟

کھوپڑیوں کے مینار

اپنے عنوان پر تو بعد میں آؤنگا پہلے میں قارئین کو یہ یاد دہانی کرانا چاہتا ہوں کہ حکمراں اور رعایا میں کیا فرق ہے؟ حکمراں زبردستی نازل ہوتے ہیں مگر ایک فریبِ نظر (Illusion) کے ذریعے یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ رعایا نے ہمیں اپنی خدمت کیلئے مجبور کیا ہے اور اب ہمارا فرض ہے کہ ہم تن ، من اور دھن سے اِس کی خدمت کریں۔ اس فریب کے تحت رعایا دو عناصر (مجبوری اور بے وقوفی) کے تحت اپنے تن ، من اور دھن کی بازی لگا کر اس امید پر اپنی کھوپڑیوں کے مینار بنانے کا پورا پورا حق حکمرانوں کو دے دیتی ہے کہ شائد ان کے بچوں کا مستقبل سدھر جائے۔ تیمور لنگ تو بے چارہ تاریخ میں خواہ مخواہ بدنام ہو گیا کیونکہ اس نے انسانوں کو فتح کرکے ان کی کھوپڑیوں کے مینار بنا دیئے تھے ان کو بوریوں میں بند کر دیتا یا مِسنگ پرسنز (Missing Persons) ڈکلیئر کر دیتا تو یہ بدنامی کا داغ دُھل سکتا تھا۔

مندرجہ بالا حقیقت ازل سے ہے اور ابد تک رہیگی لیکن اللہ کے پیغمبر اس کیٹیگری میں نہیں آتے کیونکہ ان کو انسانیت کی فلاح ہی کے لئے بھیجا گیا تھا لیکن کیا قارئین میں سے کوئی ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے کسی

ایک کا نام بتا سکتا ہے جس کی بتائی ہوئی باتوں میں سے دس فیصد پر بھی کوئی ایک پیروکار عمل کر رہا ہو؟ اس پر طرّہ یہ کہ ابھی بلوچستان میں زلزلہ والے روز مولانا طاہر اشرفی صاحب خوف کے عالم میں ایک ٹی وی چینل پر یہ دعا فرما رہے تھے "ہمارے گناہوں، ہماری غلطیوں اور ہماری ذلالتوں کو معاف فرما دے"۔ بالکل صحیح فرمایا اور پورے عالم اسلام میں نام نہاد اسلام کے ٹھیکیدار یہی دعا مانگتے ہیں۔ میری عمر 67 سال ہو چکی ہے اور جب سے ہوش سنبھالا ہے یہی دعا سنتا چلا آ رہا ہوں۔ میرا سوال ہے کہ اللہ کیوں معاف کردے جواب ملتا ہے وہ بڑا غفور و رحیم ہے اور پھر ہم محمد ﷺ کے پیروکار ہیں اس لئے ہمیں معافی نہ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں سوچتا ہوں کہ اسی غفور و رحیم کی کتاب جو ہمیں محمد ﷺ کے ذریعے ملی، آدھی سے زائد بھری پڑی ہے کہ "ہم نے تم سے پہلی والی قوموں کو کس وجہ سے اور کیسے نیست و نابود کیا جن میں ہماری سب سے پسندیدہ قوم بنی اسرائیل بھی شامل تھی"۔

قابلِ سزا تو ہے ہی قابلِ ترس بھی ہے یہ گھمنڈی نام نہاد مسلم اُمہ۔ سائنس تو دور کی بات، انسانی فطرت سے بھی انجان ہے۔ پانی کے گلاس میں نمک ملانے سے کبھی پانی میٹھا نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ سائنس کا اصول ہے اور سائنس ہی تو اللہ کا پسندیدہ مضمون ہے جس کے تحت نظامِ کائنات چل رہا ہے۔ انسانی فطرت کا اصول یہ ہے کہ جب میرے بچّے اور ان کے بچے ایک مرتبہ غلطی کرتے ہیں

تو معافی مانگنے پر میں معاف کر دیتا ہوں دوبارہ بھی ڈانٹ ڈپٹ کر کے ٹال دیتا ہوں لیکن تیسری بار معافی کی اجازت ہی نہیں دیتا بلکہ وارننگ دیتا ہوں کہ کم از کم ایک ماہ اپنے عمل سے ثابت کرو کہ ایسی غلطی اب نہیں ہوگی پھر مجھ سے بات چیت کرنا۔ یاد رہے کہ یہ ان چھوٹی چھوٹی غلطیوں کی بات ہو رہی ہے جو ہم سب سے صبح و شام ہوتی ہیں کسی بڑی غلطی کی معافی کی تو گنجائش ہی نہیں۔ بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی صبح و شام جھوٹ، کم تولنا، غیبت، مسکینوں کا مال کھانا، رشوت، چوری اور ہر طرح کی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کو ایک مرتبہ نہیں سالہا سال سے معاف کر رہا ہے لیکن آخر کب تک؟ انفرادی ندامت اور اس کے بعد اپنے اعمال کی اصلاح سے اپنا ضمیر بھی مطمئن ہوتا ہے اور اس کے بعد تنہائی میں خشوع و خضوع کے ساتھ دعا مانگنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ یقیناً رحیم و کریم ہے ضرور سنے گا لیکن ٹی وی چینلز پر اجتماعی طور پر ڈھٹائی سے اقرار کرنا کہ " ہاں ہم صبح و شام تیری اور تیرے رسول کی نافرمانی کر رہے ہیں تو ہمیں تو معاف فرما مگر کافروں کو نیست و نابود کر دے" مگر مچھ کے آنسو بہا کر ڈرامہ ختم ہوتے ہی میڈیا مالکان سے ریٹنگ بڑھانے کا اضافی بونس کا تقاضہ ہی نہیں بلکہ چھوڑ کر دوسرے چینل پر جانے کی دھمکیاں دینے والے اس عہد کے جید علماء کا تمغہ تو حاصل کر سکتے ہیں لیکن ان کے ساتھ اجتماعی دعا کرنے والوں کو بھی اب معافی نہیں مل سکتی اور نہ ہی ملنی چاہیئے۔ گویا نہ ہی حکمرانوں کی معافی کی گنجائش ہے اور نہ

ہی رعایا کی کیونکہ یہ جیّد نام نہاد علماء بھی ہم نے ہی پیدا کیئے ہیں۔ اب نہ تو کھوپڑیاں
رہیں گی نہ ہی کھوپڑیوں کے مینار بنانے والے، سب کچھ یہ دھرتی نِگل جائے گی۔

قومی زبان

بنیادی طور پر اردو کوئی زبان نہیں بلکہ ایک وسیلہء گفتگو ہے جو مختلف النّوع اقوام کے مابین اظہارِ خیال کی غرض کے تحت استعمال کیا جاتا ہے اور اسی مقصد کے حصول کیلئے اسمیں مختلف دیگر زبانوں کے الفاظ شامل کرکے اس کو لشکری زبان کے خطاب سے نوازا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آگرہ میں پیدائش اور آباؤ اجداد کے مستقل رہائش پذیر ہونے کے باوجود مجھے اپنے بزرگوں کے بیشتر الفاظ کا مطلب سمجھ نہیں آتا تھا۔ لیکن یہ محض اردو کی بد نصیبی نہیں بلکہ دیگر کئی زبانوں کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہے مثلاً انگریزی، فرانسیسی، جاپانی اور چینی وغیرہ۔ ان ممالک میں معروف اداروں کے زبان سے متعلق مختصر کورس کرنے کے بعد میں نے جرمن زبان کا گوئٹے انسٹیٹیوٹ سے ڈپلوما کیا تو میں اس نتیجہ پہ پہنچا کہ عصرِ حاضر کے ترقّی یافتہ دور کی پچھلی چار دہائیوں سے اگر کوئی زبان کہلانے کا حق رکھتی ہے تو وہ محض جرمن زبان ہے جس کی تصدیق " دی کنسائزڈ آکسفورڈ ڈکشنری آف کرنٹ انگلش میں " انگلش اُوور ففٹین سنچریز" صفحہ نمبر ix "اوریجنز" کے عنوان کے تحت ہوتی ہے۔

بہر حال جہاں دیگر زبانوں میں مختلف ملغوبوں کو بادلِ نخواستہ قبول کرتے ہوئے اُن کو زبان ہی تسلیم کیا جاتا ہے لہٰذا اُردو کو بھی ہم زبان ہی تسلیم کرتے ہیں لیکن میری بہت مؤدبانہ گزارش ہے کہ بقر عید کی قربانی کے بکرے کی ہڈیوں کی طرح رہی سہی اردو کی ہڈیوں کا اناڑی قصّابوں کے ہاتھوں قیمہ بنانے سے بچانے میں اپنا اپنا کردار ہمّت و استقامت کے ساتھ ادا کیجیئے۔ ویسے تو بیشمار مثالیں ہیں لیکن اس وقت صحت کی ناتوانی کی وجہ سے گنتی کی تکلیف دہ امثال درج ذیل ہیں :-

- ماورائے عدالت
- علی الصبح
- کورنگی میں تیل کے ایک ڈپو میں آگ لگ گئی
- پشاور میں خود کش حملہ آور پکڑا گیا

میری ناچیز رائے میں اگر تلفّظ صحیح کرنے کیلئے ہماری ویب پر آواز کا اضافہ کر دیا جائے تو شاید اُردو کی ہڈیوں کا مزید قیمہ بننے سے روکا جاسکے۔

پہلے تربیّت پھر تعلیم

موجودہ دور کی نسل خصوصاً چھوٹے بچّے یا تو جانتے نہیں یا بھولتے جا رہے ہیں کہ اخلاقیات کیا چیز ہے۔ تعلیم حاصل کر لینے کے باوجود بھی اُن کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ گھر کے اندر یا گھر سے باہر کس قسم کا رویّہ اختیار کرنا ہے۔ بسا اوقات وہ جانتے بھی ہیں لیکن پھر بھی جان بوجھ کر مثبت و اچھے رویّے اپنانے کے بجائے منفی رویّہ اختیار کرنے میں اپنی بڑائی اور فخر محسوس کرتے ہیں۔ اِس مرض کے اسباب پر ہم بحث نہیں کریں گے بلکہ یہ باور کرانے کی کوشش کریں گے کہ تعلیم یافتہ انسان اچھے اخلاقی رویّہ کے بغیر اَن پڑھ جاہل ہی کہلائے گا۔ لہٰذا تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیّت نہایت ضروری ہے جو بنیادی طور پہ گھر سے شروع ہوتی ہے۔ تعلیم تو مسلسل جاری رہنے کا عمل ہے لیکن مثبت تربیّت کی ایک مرتبہ مضبوط بنیاد رکھ دی جائے اور ہم یہ تہیّہ کر لیں کہ اِس مثبت رویّہ سے ہم زندگی میں کسی بھی لمحے روگردانی نہیں کریں گے تو ہماری شخصیّت میں ایک ایسی تبدیلی آتی ہے کہ نہ تو ہمیں اِس کے اعادہ کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی زندگی میں کبھی کوئی ہم پر انگلی اُٹھا سکتا ہے۔

بہت کم گھروں میں معاشرتی تربیّت پہ توجّہ دی جاتی ہے اور بہت کم اسکولوں

میں اِس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ نہ صرف ہماری زندگی کو معیاری بنانے بلکہ ایک مثالی معاشرہ اور ایک بہترُ ملک بنانے میں یہ کس قدر اہم ہے۔ میں نے اسی اہمیّت کے پیشِ نظر ایسے موضوعات پر مبنی ایک کتاب لکھی ہے جن کے ذریعے ہم گھر میں اپنے بچّوں کی زندگی کے ہر زاویے سے اچھی تربیّت اور مثبت رویّے کی ایسی مضبوط بنیاد رکھ سکیں جس پر عمل پیرا ہو کر آنے والی نسلیں ایک تہذیب یافتہ معاشرہ فراہم کر سکیں اور ہمارا ملک بھی کم از کم تہذیب یافتہ ممالک کی فہرست میں شامل ہو جائے۔

معاشرتی تربیّت کے نتیجہ میں جو مثبت عنصر نمایاں ہوتا ہے وہی کسی قوم کا چہرہ ہوتا ہے اور کسی بھی قوم کی شناخت میں سب سے پہلے نمبر کا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اِس تربیّت Civic یا Social Sense کے نتیجہ میں جو شعور اُجاگر ہوتا ہے اُس کو انگریزی میں بھی کہتے ہیں۔ اِس کے بغیر کسی بھی قوم کو جاہل یا پَس ماندہ سمجھا جاتا ہے خواہ Sense اُس میں تعلیم یافتہ افراد کا تناسب زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً کوئی قوم ایٹم بم اور میزائل تو بنالے لیکن ٹریفک سگنل کی سُرخ بتّی کو خاطر میں نہ لائے یا ٹرین کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے سب کو دھکّے دیتا ہوا کھڑکی تک جا پہنچے۔

مندرجہ بالا باتیں کوئی نئی نہیں اور نہ ہی میں پہلا شخص ہوں جو یہ موضوع

لیکر بیٹھا ہوں لیکن اِس اعادہ کے پیچھے میری ایک تمنّا ہے اور وہ یہ کہ ۶۸ سال گذرنے کے بعد بھی مندرجہ بالا شعور کے آثار میرے ملک میں کہیں نظر نہیں آتے تو کوئی بات نہیں، اب تک کی نسلوں نے جو شرمندگی اُٹھالی سُو اُٹھالی لیکن میرے اِس اعادہ کو آج اگر ٹلک کے تمام پرائمری اسکولوں کے نصاب کا لازمی حصّہ بنا دیا جائے تو شاید آئندہ آنے والی نسلیں بین الاقوامی دنیا میں شرمندگی کی زندگی نہ گزاریں۔

اخلاقیات ہے نہ کہ قانون پہ عملدرآمد، جو کہ (Focus) اصل میں ہمارا مرکزی نکتہ ریاست اور حکومت کی ذمّہ داری ہے، لہٰذا ہم قانون کی خلاف ورزیوں اور اُن کے نتائج کے بجائے زندگی کے ہر قدم پر اخلاقیات کے ہماری شخصیت پر اثرات کے بارے میں بات کر رہے ہیں جس کے نتیجہ میں ایک بہتر، تہذیب یافتہ معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ قانون کی پاسداری سزا کے خوف کے بجائے اخلاقی ذمّہ داری سمجھ کر کی جائے تو ہم بہتر انسان کہلانے کے مستحق ہونگے۔ اگر ہم اخلاقی پستی کا شکار ہوں اور قانون بھی اپنی ذمّہ داری پوری نہ کرے تو نتیجہ یہی ہوگا جو آج ہمارے سامنے ہے۔ اس کتاب میں کسی مذہب، ثقافت یا علاقائی روایات کو نہ تو موضوع بنایا گیا ہے اور نہ ہی تقابلی جائزہ لیا گیا ہے بلکہ اشرف المخلوقات جنابِ حضرتِ

انسان اور حیوان کے درمیان اُس تفریق کا اعادہ کیا گیا ہے جس کی بنیاد پر معاشرہ اور اقوام کی پہچان ہوتی ہے۔ آج ہم جس ذہنی پستی اور اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار ہیں اِس کا میری نظر میں محض ایک ہی حل ہے کہ ہم اپنے بچّوں کو اُس رَوِش پر چلنے سے پہلے تہذیب یافتہ اقوام کی صَف میں کھڑا ہونے کے قابل بنانے کی کوشش کریں۔

بھینس، چڑیا اور بِلّا

شدید طوفان تھا۔ تیز ہواؤں کے ساتھ برف کے گالے بھی پڑ رہے تھے۔ چڑیا نے بہت کوشش کی کہ درخت کی ٹہنی کے ساتھ چمٹی رہے لیکن طوفانی ہوا کے آگے ٹھہر نہ سکی اور نیچے آن پڑی۔ اُڑنے کی کوشش میں بہت پھڑ پھڑائی لیکن پَروں پر برف پڑ جانے کی وجہ سے اُڑ نہ سکی اور زمیں پر پڑی تھی۔ ایک بھینس اپنی طاقت کے زُعم میں ٹہلتی جا رہی تھی کہ اچانک عین اس جگہ رُک کر گوبر کر دیا جہاں بے چاری چڑیا پڑی تھی اور وہ اُس کے نیچے دب گئی۔ گوبر کی گرمی کی وجہ سے چڑیا کے پروں پر پڑی برف پگھلنے لگی اور چڑیا نے ہمّت کر کے ہِل جُل کر اپنی گردن گوبر سے باہر نکالی۔ جوں ہی اس نے گردن نکالی، قریب ہی درخت کے نیچے بیٹھے بِلّے نے بجلی کی پھرتی کے ساتھ اچھل کر اس کی گردن دبوچ کر اسے گوبر سے باہر نکالا، خوب اچھی طرح صاف کیا اور کھا لیا۔ یہ کہانی تو ختم ہو گئی لیکن اندر کی کہانی ابھی باقی ہے۔

بظاہر لگتا ہے کہ اس کہانی میں قدرت چڑیا کی دشمن ہے جس نے اسے اُڑنے سے مجبور کر کے نیچے گرایا، کچھ لوگوں کا خیال ہوگا کہ بھینس چڑیا کی دشمن ہے کیونکہ اس نے گوبر کر کے اسے اس میں دبا دیا اور کچھ یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ اصل دشمن بِلّا ہے جو اس کو کھا گیا۔ اور یہ تو ایک الگ ہی بحث ہو گی کہ

ایسا نہ ہوتا تو یوں نہ ہوتا لیکن پھر کہانی کیسے وجود میں آتی؟ اور جب کوئی شے وجود میں آتی ہے تو اختلافِ رائے بھی پیدا ہوتا ہے۔ قدرت پر تو بے سود بحث ازل سے جاری ہے اور ابد تک رہیگی کیونکہ یہ قادرِ مطلق کی ایک خصوصیت ہے اور اس کا کوئی ثانی نہیں۔اب بھینس کو لیجیئے اس نے گوبر کرکے مارنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس سے تو برف پگھلی اور چڑیا کی جان میں جان آئی۔ بِلّے نے تو اس کو گوبر کی گندگی سے نکال کر صاف کیا اب کھاتا نہ تو کیا کرتا اُس کو بھی تو زندہ رہنے کا حق ہے۔ چڑیا نے گردن باہر کیوں نکالی؟ نہ نکالتی تو گوبر میں دم گھٹ کر مر جاتی وغیرہ وغیرہ۔

ظاہری کہانی ہو یا اندرونی، ہر کہانی کے پیچھے ایک حقیقی کہانی ہوتی ہے اور حقیقت کی دنیا میں بسنے والی قومیں ہی حقیقت کے رازوں سے پردہ اُٹھا سکتی ہیں۔ منافق اور کاذب کبھی حق پرست نہیں ہو سکتے۔اس کہانی کے پیچھے بے شمار کہانیاں ہو سکتی ہیں۔ میں تو محض اشارے دے سکتا ہوں:-

1. قادرِ مطلق (جس کو ہم بھول گئے)
2. اسلامی جمہوریہ پاکستان (جس کو ہم بھول گئے)
3. پرویز مشرف (جس کو ہم بھول گئے)
4. آصف علی زرداری (جس کو ہم بھول گئے)
5. بے نظیر بھٹو (جس کو ہم بھول گئے)

6. نواز شریف (جس کو ہم بھول جائنگے ل)

7. الطاف حسین (جس کو ہم بھول جائینگے)

8. ریاستہائے متحدہ امریکہ (جس کو ہم کبھی نہیں بھولینگے)

طویل مایوسی کے بعد

ایک طویل مایوسی کے بعد آج محسوس ہو رہا ہے کہ تمام عمر منفی سوچ، غیر یقینی کی کیفیت اور تنقیدی مزاج کے باوجود ایک لاشعوری قوت جو چپکے چپکے، نحیف سی پیچھے پیچھے اور آہستہ آہستہ چلی آ رہی تھی وہ باشعور، توانا و دلیر ہو کر سامنے آ کر ببانگِ دہل کہہ رہی ہے کہ میں منفی کو منفی سے ضرب دینے کے نتیجہ میں آنی والی وہ قوت ہوں جو تنقید ضرور کرتی ہوں مگر دلائل کے ساتھ کیونکہ چاپلوسی میرا شیوہ نہیں، غیر یقینی کی کیفیت اُس وقت تک طاری رہتی ہے جب تک حواسِ خمسہ اکثریتی فیصلہ نہ سنا دیں یعنی پانچ میں سے تین متفقہ طور پر چھٹی حِس کے منفی سوچ کے احساس کو، جو مثبت سوچ کے متواری بیک وقت جنم لیتا ہے۔آج کا دن اس لیئے بدلا ہوُا دن ہے کہ جناب عطا محمد تبسّم صاحب نے مجھ غیر پیشہ ور کالم نگار کے بارے یہ تبصرہ فرمایا :-

" السلام و علیکم مسرت صاحب، اچھی کہانی سوچ کے کئی زاویئے مہیا کرتی ہے، ماشا اللہ اچھا لکھتے ہیں لکھنے پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے،پروفیشن کچھ بھی ہو اصل چیز لکھنا پڑھنا ہے، وزیر آغا، خالد اختر، اور جانے کتنے لوگ انجینئیر تھے۔ لیکن لکھنے والوں میں شامل ہوئے، آپ اچھا لکھتے ہیں، جاری رکھیں"۔ عطا محمد تبسم

نا معلوم کن اسباب نے مجھے ایک ایرو ناٹیکل انجینئر بنا دیا اور بیالیس برس قومی ائرلائن کی خدمت کی، ریٹائرمنٹ کے بعد کالم نگاری اور ساتھ ہی ایک کتاب بھی لکھ ڈالی، کمپیو ٹر پہ اردو انگریزی دونوں خود ہی لکھتا ہوں میرے پاس نہ تو کوئی لائبریری ہے اور نہ کوئی اسسٹنٹ، خدا بھلا کرے دو عدد "ڈاٹ کام" کا یعنی ہماری ویب اور گوگل۔

جناب عطا محمد تبسّم صاحب نے میری اس بچپن کی سوچ پہ مہر تصدیق ثبت کی ہے کہ کوئی بھی انسان کچھ بھی کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کے اندر سچی لگن، محنت کا جذبہ اور دیانت داری ہو۔ نویں جماعت میں اُردو مضمون لے لیا، آسان شاعری میں مزہ آیا جیسے نظیر اکبر آبادی کا "آدمی نامہ"، لیکن دسویں جماعت میں اردو نثر بھی سر کے اوپر سے گذرنے لگی تو درخواست دے کر سائنس لے لی مگر وہ بھی گلے پڑ گئی۔ اصل میں اس عمر میں اپنے مطلب کے شعر سب کو اچھے لگتے ہیں اور "چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے" کے مصداق عرض کیا ہے جس سے لڑکپن کی یادیں بھی تازہ ہونے کی اُمید ہے :-

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

نعمت جو کھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا
شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہتا تھا بر ملا
یہ بات ہے سمجھنے کی، آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
مرنے میں آدمی ہی، کفن کرتے ہیں تیار
نہلا دھلا اٹھاتے ہیں، کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں، روتے ہیں زار و زار
سب آدمی ہی کرتے ہیں، مردے کا کاروبار
اور وہ جو مر گیا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی، امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی، قرآن اور نماز، یاں
اور آدمی ہی اُن کی چراتے ہیں جوتیاں
"جو اُن کو تاڑتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

مرمّت کرنے لگا جہاز ، عاشقی کے ساتھ "
کالم لکھ رہا ہے بڑے مزے کے ساتھ
لکھنے پر کسی کی اجارہ داری نہیں
عطا صاحب نے کہا کسی اور نے نہیں
"پروفیشن کچھ بھی ہو اصل میں تو ہے آدمی

وَتُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ

اکثر و بیشتر ہم اپنی تعریف اور کبھی کبھار دوسرے کی تعریفی کلمات سُن کر اپنے آپ کو ترجیحی طور پر اور دوسرے کو ثانوی طور پر اللہ کا نیک و برگزیدہ مسلمان ثابت کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں اور قطعی طور پر یا تو بھول جاتے ہیں یا سمجھتے نہیں کہ اللہ ہمارا ذاتی رشتہ دار نہیں بلکہ وہ تو ربّ العالمین ہے اور "جس کو چاہے عزّت دینے کیلئے مسلمان کی شرط اس نے نہیں لگائی لہذا کسی کافر کو بھی یہ اعزاز حاصل ہو سکتا ہے"۔

(BC 87–141) میں چین نے کاغذ، (AD960-907) میں بارود (AD 1333-1290) میں چھاپہ خانہ یعنی پریس اور (BC – 220 AD 202) میں قطب نما یعنی کمپس ایجاد کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ قبل از شانگ دورِ بادشاہت 8500 to 1500 BCE مختلف قسم کی کُل 19، بعد از دورِ بادشاہتِ شانگ (c. 1600– BC 1050) میں کل 128 اور 1949 سے آج تک کل 14 عدد ایجادات کر چکا ہے۔ اِن میں معمولی سی معمولی مثلاً ٹوائلٹ پیپر، درمیانہ درجہ کی جیسے سِول سروس کا امتحان خالص میرٹ کی بنیاد پر اور انسان کی سوچ سے آگے و حیران کُن ایجاد "اِسٹیم سیل ایجوکیٹر تھیراپی" بھی شامل ہے جو 2012 میں کی۔

مارچ 2014 میں ملائیشیا کا ایک مسافر طیارہ کوالا لمپور سے بیجنگ جاتے ہوئے لاپتہ ہوگیا اور آج اکتیسویں دن تک اس کا سراغ نہ لگ سکا۔ نہ معلوم کیوں مجھے چند گھنٹوں بعد سے ہی اپنے آپ سے شرمندگی محسوس ہونا شروع ہو گئی شاید اس لئے کہ میں اپنے آپ کو سائنس و ٹیکنالوجی کی بے پناہ ترقّی کا وکیل سمجھتا ہوں حتّٰی کہ آج کل اللہ کی ذات کو بھی سائنس کے ذریعے ثابت کرنے کی کوششوں میں مصروفِ عمل ہوں۔ اصل میں اکتالیس سال ائر لائن میں انجینئر رہنے کے باعث تقریباً تمام ترقّی یافتہ ممالک کے دورے کئے تو ایمان ڈگمگا گیا اور شک ہونے لگا کہ کافروں نے ہی ترقّی کیوں کی لیکن انجینئرنگ کے ساتھ ساتھ لگ بھگ تمام مشہور مذاہب کا جائزہ اور اسلام سے موازنہ کا شوق و جستجو بھی ہنوز جاری ہے، عالمِ دین تو نہ بن سکا شکر ہے، البتّہ بنیادی نکتہ ضرور پا لیا کہ کسی مذہب یا آئیڈیالوجی میں جھوٹ کی گنجائش نہیں۔ صرف اس ایک نکتہ کو بنیادی پیمانہ مان کر اقوام کی ترقّی کے ساتھ ساتھ انفرادی شخصیتوں کو بھی جانچا اور یوں میرا ڈگمگاتا ایمان اس یقین کی کیفیت کے سہارے بِنا کسی سائنسی لیبارٹری کے اللہ کو پہچاننے میں کامیاب ہوگیا۔ آج نہ تو کسی قسم کی شرمندگی ہے، نہ شک و شبہ اور نہ کوئی بے چینی۔ مجھے حتمی طور پر یقینِ کامل ہے کہ جب تک سچ یعنی حق کا سہارا ہوگا اُس کو عروج ہوگا خواہ وہ فردِ واحد ہو یا کوئی قوم کیونکہ حق "اللہ" ہے اور وہ سب کا ہے۔

ترقی یافتہ اقوام میں جب تک سچّے لوگ تھے ان کا گراف اوپر جا رہا تھا، جب سے جھوٹوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اُن کا گراف نیچے آنا شروع ہوا حتّٰی کہ وہ نیست و نابود ہو گئیں۔ یونانی قوم سے شروع کروں، مصری قوم سے یا سلطنتِ عثمانیہ سے، چھوڑیئے اتنا وقت آپ کے پاس ہے نہ میرے پاس کیونکہ بیچ میں عراق و افغانستان پر حملہ کے جواز کا جھوٹ آ جائیگا اور بحث چل نکلے گی۔ آج کے جھوٹ پر آ جائیں۔ ملائیشیا کا جہاز ترقی یافتہ جھوٹوں نے غائب کیا لہٰذا اسقدر ماڈرن سائنس و ٹیکنالوجی سے لیس سیٹیلائٹس، ہوائی جہاز و بحری جہاز اور جدید ترین الیکٹرونک ساز و سامان کے باوجود شرمندگی کے علاوہ اور کچھ نصیب نہ ہوا اور 1949 میں دیوارِ چین کی قید سے آزاد ہونے والی قوم نے محض ایک بحری جہاز سے اُتاری جانے والی ربڑ کی کشتی سے ایک بانس کے سرے پر بندھا ہوا مائیکروفون سمندر میں پھینک دیا اور اُس کی تاریں دوسرے سرے پر ایک الیکٹرونک آلہ میں مشہور سائنسداں آرشمیدس کا نعرہ "پا لیا، پا لیا" بھیجنے لگیں جن کی زبان 37.5 کلو سائیکل کی تھی جو فلائٹ ڈیٹا ریکارڈر سے آ رہی تھی جو میں نے 1964 میں بطور ٹیکنیشن فوکر جہاز کے ریکارڈر کی مرمّت سے شروع کر کے میں بوئنگ 777 کے ریکارڈر تک کی مرمّت کے دوران انجینئر کی حیثیت سے 2005 سنی تھی۔

پہلے تو بے چارے چینیوں کا ترقی یافتہ ممالک کے میڈیا نے مذاق اُڑایا لیکن پھر خفّت مٹانے کیلیئے اپنے جدید ترین آلات سے لیس جہاز اُس جگہ بھیج کر اور فلائٹ ڈیٹا ریکارڈر کا سگنل موصول کرکے تمام تلاش و تفتیش کے عمل کے انچارج بن گئے، مزید شرمندگی مٹانے کا سہارا اس وضاحت سے لینے کی کوشش کی کہ وہ سگنل تو دو روز پہلے ہم نے بھی موصول کرلیا تھا مگر ہمارے جہاز پر چونکہ میڈیا کا کوئی نمائندہ نہ تھا اس لیئے خبر عوام تک نہ پہنچا سکے جبکہ چینی کشتی پر میڈیا کا نمائندہ موجود تھا لہٰذا اُنھوں نے پہلے خبر دے دی اور اب ایک جھوٹ چھپانے کیلیئے سو جھوٹ بولنے پڑ رہے ہیں لیکن وہ بھولے بیٹھے ہیں کہ "سچ کا بول بالا، جھوٹ کا منہ کالا"۔ یہاں ایک حدیث بھی یاد آ رہی ہے کہ علم حاصل کرنے کیلیئے چین بھی جانا پڑے تو جاؤ" معلوم نہیں کتنی مستند ہے مگر سُن " بچپن سے رہا ہوں۔

اگرچہ زن ، زر اور زمین کا حصول بنی نوع انسان کی جبلّت میں شامل ہے لیکن اس میں سلیقہ ہو تو اس دھرتی پر فساد برپا نہ ہو۔ چلو جو ہوُا سو ہوُا اب بھی میرا مشورہ مان لیں تو انگڑائی لیتے ہوئے تیسری جنگِ عظیم کے خطرات ٹل سکتے ہیں۔ گزشتہ ادوار میں نہ اتنی تعلیم تھی اور نہ ہی شعورِ کامل۔ قبل از تاریخ سے لیکر آج تک لاتعداد آسمانی صحیفے و انسانی حقوق کی تنظیمیں بشمول اقوامِ متحدہ اس انسان کو اشرف المخلوقات کے مقام پر عملی طور پر کھڑا کرنے میں ناکام رہیں۔ البتہ ان کے ٹھیکے داروں نے انسان کو ظلمتوں کی اجتماعی قبر میں زندہ دفن کرکے اس پر چراغاں کرنے میں کُرہ ارض کی ساری دولت لنڈھا دی۔

موجودہ اور آئندہ جنم لینے والی "سُپر پاورز" کو میرا مشورہ ہے کہ 31 اکتوبر 1451 کو اٹلی میں پیدا ہونے والے کرسٹوفر کولمبس کے امریکہ دریافت کرنے سے لیکر 1755 تا 1763 کے دوران جس طرح فرانسیسی، برطانوی اور ہسپانوی فوجوں نے وہاں کے مقامی باشندوں کو مار بھگا کر آخر کار مشرقی ساحل سے لیکر مغربی ساحل تک نیویارک و لاس اینجلس جیسی ریاستیں قائم کیں کہ اُس وقت سے لیکر آج دن تک تمام دنیا کے لوگ وہاں کھچے چلے جاتے ہیں۔ لاٹری کیلئے درخواستوں کے

انبار اور ویزا کے حصول کیلئے قطار در قطار دھوپوں اور بارشوں میں دھکّے کھانے اور وہاں پہنچنے کی کاوشوں میں والدین کی زندگی بھر کی کمائی و ہر جائز و ناجائز طریقہ استعمال کرنے کے باوجود لوٹا دیئے جانے والے ایک مرتبہ پھر اُسی جدوجہد کو شروع کر دیتے ہیں، آخر کوئی تو بات ہے! محض اسی طرز پر اور اسی طریقہ کار کے تحت باقی دریافت شدہ برِ اعظموں کو ایسی جنت کیوں نہیں بنا دیتیں؟

بھئی سیدھی سی بات ہے جہاں کی زمین میں دولت ہے وہاں کے حکمرانوں سے میز پر بیٹھ کر محض تین باتیں کریں:-

1. آپ دولت نکالیں اور اپنی مزدوری نکال کر باقی ہمارے پاس جمع کرادیں۔

یا

2. ہمیں دولت نکالنے کی اجازت دیں تاکہ ہم آپ کے ملک کو اپنے ملک جیسا بنا دیں۔

یا

3. ہم اقوامِ متحدہ اور دنیا کی تمام انسانی حقوق کی تنظیموں سے منظوری کے بعد آپ کو نیست و نابود کر دیں۔

اگر موجودہ اور آئندہ جنم لینے والی "سُپر پاورز" میرا یہ مشورہ مان لیں

تو اس کرہ ارض پر بچ جانے والی مخلوق سکھ کا سانس لے گی اور یوں مشرق سے مغرب و شمال سے جنوب تک ایک ہی طرح کے انسان ہونگے جو ایک دوسرے کو اشرف المخلوقات پکاریں گے۔اس میں نہ تو کوئی مذاق کی بات ہے اور نہ ہی مایوسی کی، کیونکہ ویسے بھی تو حکمران ہی ہماری قسمتوں کے فیصلے کرتے ہیں جو ہم بے وقوف عوام کی مخالفت کی وجہ سے آٹھ آٹھ دس دس سال کے لئے ٹل جاتے ہیں اور بعض مرتبہ تو کوئی حکمران بھی بے وقوف نکل آتا ہے جس کی وجہ سے جنگوں حتّٰی کہ جنگِ عظیم اوّل و دوم تک کی نوبت آ جاتی ہے جن میں کسی حکمران کا بھی نقصان ہونے کا خدشہ ہوتا ہے، عام انسان کا نقصان تو ہوتا ہی رہتا ہے لیکن اگر حکمران نہ رہے تو دنیا کا نظام کون چلائے گا؟ حکمرانی آسان کام نہیں، دنیا کے تمام فنون میں سب سے مشکل فن ہے اور مصیبت یہ ہے کہ اس کی کوئی یونیورسٹی اس روئے زمیں پر موجود نہیں اس فن کو سیکھنے کے لئے انڈر ورلڈ سے بھی نیچے مزید گہرائی میں جانا پڑتا ہے اور وہ بھی "ون ٹو ون"۔ اکٹھے کلاس بنا کر نہیں حتّٰی کہ باپ بیٹے کے ساتھ نہیں اور بیٹا بھائی کے ساتھ نہیں، ہر ایک کو اکیلے اکیلے چھپ چھپ کر کلاسیں اٹینڈ کرنا ہوتی ہیں اور امتحان بھی اکیلے بغیر کسی امداد کے دینا پڑتا ہے۔

مجھے معلوم سب ہے مگر کمبخت ضمیر نے مجھے حکمران بننے نہ دیا ورنہ رشتہ تو میرا بھی ابراہیم لنکن اور اکبرِ اعظم سے بہت قریبی ہے۔ مندرجہ بالا مشورہ

اس مجبوری کے تحت دیا کہ پاکستانی ہوں لہٰذا مفت مشورہ مجھ پر فرض ہے کوئی نہ مانے
تو اس کا اپنا نقصان ہے۔

میں نے ز، ز اور ز کالم کیوں لکھا؟

اس سے پیشتر میں نے 16 اپریل کو ز، ز، اور ز آرٹیکل لکھ کر سیاست کے موضوع کے تحت جمع کرایا لیکن وہ 21 اپریل تک شائع نہ ہوا تو میں سمجھ گیا کہ مجھ سے ہی کوئی غلطی ہوئی ہے لہٰذا میں نے 21 اپریل کو طنز و مزاح کے موضوع کے تحت دوبارہ جمع کرایا اور اسی روز شائع ہو گیا۔ اس سے ایک بار پھر یہ ثابت ہو گیا کہ ہمارے ملک میں سیاست کو مزاح ہی کے طور پر لیا جاتا ہے اور الیکٹرونک میڈیا میں بھی ڈاکٹر یونس بٹ صاحب جیسے عظیم لکھاری بھی طنز و مزاح کو ہی اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا ذریعہ بناتے ہیں لہٰذا " ہماری ویب" نے بھی کوئی زیادتی نہیں کی اور مجھے بھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

دوسری بات "بین الاقوامی سیاست" یعنی تیسری جنگِ عظیم کے منڈلاتے بادل جس کی جانب میں نے کچھ اس طرح اشارہ کیا تھا کہ یہ بادل ملائیشین ائر لائن کا طیارہ غائب ہونے سے جنوبی چینی سمندر (ساؤتھ چائنا سی) سے اُٹھے اور یوکرائن تک پہنچ چکے ہیں جس کی تصدیق درج ذیل رپورٹ میں گریگ ٹوروڈ اور مائیکل مارٹینا نے 23 اپریل یعنی کل رائٹر کے ذریعے کی:-

"HONG KONG/BEIJING (Reuters) - When Chinese naval supply vessel

Qiandaohu entered Australia's Albany Port this month to replenish Chinese warships helping search for a missing Malaysian airliner, it highlighted a strategic headache for Beijing - its lack of offshore bases and friendly ports to call on."

جوں کا توں کاپی پیسٹ اس وجہ سے کیا کہ مَبادا میرے ترجمے میں کوئی کثافت شامل نہ ہو جائے۔ یہ تو ہے رپورٹ کی شروعات اور اب میں اس کی ہائی لائٹس پیش کرتا ہوں :-

"China is determined to eventually challenge Washington's traditional naval dominance across the Asia Pacific and is keen to be able to protect its own strategic interests across the Indian Ocean and Middle East.", "The United States, by contrast, has built up an extensive network of full bases - Japan, Guam and Diego Garcia - buttressed by formal security alliances and access and repair agreements with friendly countries, including strategic ports in Singapore and Malaysia.", "China's first carrier, the Liaoning, a Soviet-era ship bought from Ukraine in 1998 and re-built in a Chinese shipyard, is being used for training and is not yet fully operational.", "Chinese officials and

analysts have bristled at suggestions by Western and Indian counterparts that Beijing is attempting to create a so-called "string of pearls" by funding port developments across the Indian Ocean, including Pakistan, Sri Lanka, Bangladesh and Myanmar.

یہ میں نے پوری رپورٹ میں سے محض وہ جملے چنے ہیں جن میں مختلف ممالک کے نام ہیں جن سے ملکر میدان جنگ کا نقشہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ رپورٹ چونکہ بہت طویل ہے اور مناسب بھی نہیں کہ میں دوبارہ اشاعت کیلئے جمع کراؤں اس لئے اس کا لنک پیش ہے تاکہ کوئی پوری پڑھنا چاہے تو ضرور پڑھے:

http://news.yahoo.com/search-mh370-reveals-military-vulnerability-china-210758573.html?soc_src=mediacontentsharebuttons

اب میں آتا ہوں تیسری بات کی طرف یعنی اپنے گزشتہ کالم کے آخری حصہ کی جانب جس میں میں نے موجودہ سپر پاور اور آئندہ وجود میں آنے والی سپر پاورز کو مشورہ دیا ہے جو بظاہر ایک مزاح محسوس ہوتا ہے لیکن میرے اسی مشورہ کی ملک کے نامور سینیئر صحافی جناب سہیل وڑائچ نے کل رات ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام میں کچھ اس طرح تصدیق کی۔ انھوں نے کہا:-

" ریاست دو قسم کی ہوتی ہیں ایک فلاحی اور دوسری دفاعی۔ فلاحی ریاست میں عوام کے ٹیکس سے عوام کی بہبود کے کام کیئے جاتے ہیں اور دفاعی ریاست میں پڑوسیوں سے دشمنی کرکے عوام کی فلاح کی بجائے جنگوں پر خرچ کیا جاتا ہے۔"

میں نے اس میں اضافہ کرکے لکھا ہے کہ جب عوام کا سارا تیل نکل جائے اور سپر پاور بن کر پوری دنیا پر حکومت کرنے کا بھوت سوار ہو جائے تو لازمی طور پر پوری دنیا کے عوام کا تل نکالنے کے بعد پوری دنیا کی دولت بھی سمیٹنے کی ضرورت پیش آئیگی۔ لہٰذا جن حکمرانوں میں ہمت ہے وہ اس پر عمل پیرا ہیں اس میں کیا مزائقہ ہے ان کو یہی کرنا چاہیے ، کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

معاشرہ پر ٹیکنالوجی کے اثرات

بلا شبہ ٹیکنالوجی کا حصول ترقی کی طرف گامزن ہونے کی نشاندہی کرتا ہے لیکن ہر تصویر کے دو رُخ ہونے کے مصداق کے تحت ٹیکنالوجی کے بھی مثبت کے ساتھ منفی اثرات ہوتے ہیں ۔ ذی شعور معاشروں میں منفی اثرات مرتّب ہونے سے پیشتر ان کے تدارک پر وقت سے پہلے غور کرکے ان کا حل تلاش کرلیا جاتا ہے ورنہ بعد میں پچھتاوہ ہوتا ہے۔مثلاً تیسری دنیا (تھرڈ وَرلڈ) کے ترقی پذیر ممالک میں موبائل فون عوام کے ہاتھوں میں بالکل ایسے آئے جیسے دلہن کی رخصتی کے موقع پر اُچھالی گئی پیسوں کی ریزگاری جیسے بھی اور جتنی بھی ہاتھ آجائے، نتیجہ ہمارے سامنے ہے اب اس تیسری دنیا (تھرڈ وَرلڈ) کے عوام کے ہاتھ تھری جی (تھرڈ جنریشن) ٹیکنالوجی لُوٹے ہوئے موبائل فونز میں آگئی ہے تو کیا ہوگا ذرا غور کیجئے :۔

1970 میں محترم ضیاء محی الدین صاحب ایک طویل عرصے بعد برطانیہ سے پاکستان تشریف لائے تو پاکستان ٹیلیویژن کراچی سے ایک نیا اور منفرد پروگرام شروع کیا جس کا نام تھا "ضیاء محی الدین شو"۔ اگر میں ضیاء محی الدین صاحب کا تعارف لکھنے لگوں تو کم از کم دس صفحات درکار ہونگے اور اگر ان کے شو کے بارے میں لکھوں تو بھی تقریباً اتنے ہی اور ، میرا اصل موضوع رہ جائیگا

لہٰذا محض اتنی تمہید کافی ہو گی کہ اس ہفتہ وار شو میں ہر ہفتہ ایک نیا موضوع ہوتا تھا اور ہر شو میں مہمان بھی مختلف مدعو ہوتے تھے۔ لیکن ایک موضوع پر محترمہ خوش بخش شجاعت صاحبہ نے موضوع کی مخالفت میں بولنا شروع کیا تو بحث طویل ہو گئی اور ایک ہی موضوع پر مسلسل چار پروگرام ہوئے اور دونوں شخصیات کا بہت چرچا ہؤا کیونکہ اس زمانے میں چینل بھی واحد تھا اور ٹیلی ویژن پر مخالفت میں بولنے کا دستور بھی نہ تھا۔آپ سوچ رہے ہونگے موضوع کیا تھا تو اس دور کا نہایت انوکھے اور پاکستانی عوام کو ہضم نہ ہونے والے موضوع کا نام تھا "جینریشن گیپ (Generation Gap) "۔ میں اس کو 2 جی سے تعبیر کر سکتا ہوں کیونکہ اس میں 2 جی استعمال ہوئے ہیں لیکن اُس وقت اس سے مُراد والدین اور اولاد یعنی پہلی اور دوسری نسل کے مابین بڑھتے ہوئے فاصلوں پر تشویش اور اس مسئلہ کا حل تلاش کرنا تھا۔ ضیاء محی الدین صاحب چونکہ برطانیہ میں ایک طویل عرصہ مقیم رہے، نہ صرف تھیٹر میں کام کیا بلکہ اُس وقت کی مشہورِ زمانہ ہالی ووڈ کی فلم لارنس آف عریبیہ میں مصری ہیرو عمر شریف کے معاون کا کردار بھی ادا کیا اور اس کے بعد اپنی تھیٹر کمپنی کھول لی چنانچہ مغربی اقدار اور ان میں رونما ہونے والی ٹوٹ پھوٹ سے بخوبی واقف تھے۔ خوش بخت شجاعت صاحبہ کراچی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل مشرقی اقدار سے بھرپور خاتونِ خانہ تھیں اور طالبِ علمی کے زمانہ میں نامی گرامی ڈیبیٹر تھیں جوش میں آ کر دیگر مہمانان کے ساتھ پروگرام کے میزبان ضیاء محی

الدین صاحب سے بھی الجھ پڑیں اور یوں پروگرام بے حد مقبول ہوا کیونکہ اس وقت یہ بالکل انہونی بات تھی۔ ہمارا معاشرہ بھی اس وقت قدرے مشرقی تھا گو کہ تبدیلی کے آثار نمایاں تھے پھر بھی مِن حیث القوم خاندانی نظام کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہیں تھا لہٰذا خوش بخت شجاعت صاحبہ کے مؤقف کو بھرپور انداز میں پورے ملک میں پزیرائی ملی۔
لیکن آج شاید اُن کا بھی مؤقف تبدیل ہو گیا ہو کیونکہ حالات نے تیزی سے کروٹ لی، کمپیوٹر آگیا تو اولادیں اس میں لگ گئیں والدین کھانے کی میز پر انتظار کرتے رہے، انٹر نیٹ کی آمد نے معلومات کے ہتھیار سے دوسری نسل (سیکنڈ جنریشن یعنی 2.جی) کو اسقدر لیس کر دیا کہ وہ والدین کو جاہل سمجھنے لگی اور اس کے بعد سوشل میڈیا نے جو بد تہذیبی کی جنگ کے ساز وسامان سے مزیّن کیا تو بڑے چھوٹے کی تمیز ہی ختم ہو گئی اور اولاد جو پہلے ہی والدین سے آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کرنے کا فن سیکھ چکی تھی وہ اب سینہ تان کر ہر دھمکی کا جواب اعلانِ جنگ سے دینے لگی۔
آیئے اب موبائل فون سے ملاقات کرواتا ہوں۔ کہاں سے آیا، کون لایا مجھے بتانے کی ضرورت نہیں کیونکہ حال ہی کی بات ہے سب جانتے ہیں میں تو محض اتنا کہوں گا کہ اس ہتھیار کو ہاتھ میں لیکر ظاہر کرنے کی ضرورت ہی نہیں یہ تو جیب میں یا تکیہ کے نیچے ہی اپنے محبوب کے دل کی ایک آواز پر پھڑ پھڑا کر آناً فاناً میں اپنے مالک کو گھسیٹ کر مقامِ آواز پر لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے

خواہ اُس لمحہ مالک کے والد یا والدہ اس سے کتنی ہی اہم بات کر رہے ہوں یا اس کی سگی اور پہلی بیوی عین اسوقت اپنی بے لوث و پاکیزہ محبت کا اظہار کر رہی ہو، یہ ہتھیار اندھا ہوتا ہے، رشتوں اور ہر قسم کے جذبات سے عاری کیونکہ اس کا نام ہے 3 جی تھرڈ جنریشن) یعنی تیسری نسل۔ بالکل واضح ہے کہ پہلی اور دوسری نسل کی اس کے) نزدیک کوئی اہمیت نہیں اور ضرورت کے تحت ان دونوں نسلوں کو ختم بھی کر سکتا ہے۔ نتیجتاً پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں "اولڈ ہومز" کھل چکے ہیں اور ہم بھی ترقی یافتہ ممالک کی صف میں اپنا سر بلند کر کے کھڑے ہو سکتے ہیں کم از کم اس میرٹ میں۔ خوش بخت شجاعت صاحبہ نے اپنا 1970ء کا موقف تبدیل کیا یا نہیں البتّہ "اولڈ ہوم" ضرور دیکھا ہے کیونکہ ایک کراچی ڈیفینس ہاؤسنگ سوسائٹی میں بھی واقع ہے جن میں تقریباً چوبیس بوڑھے والدین لاوارثوں کی طرح پڑے ہیں حالانکہ ان کی اولادیں مؤکل گھرانوں کی طرح کراچی ڈیفینس ہاؤسنگ سوسائٹی میں ہی قیام پذیر ہیں بس ان کی مجبوری یہ ہے کہ ان کے پاس اپنا خریدا ہوا مہنگا ترین موبائل فون 1980ء کی ٹُو جی (جی) ٹیکنالوجی والا آ گیا تھا اور اسی نے مجبور کر دیا کہ سوتیلی بیوی کو دوسری کوٹھی 2 دینی پڑی۔ اب 3 جی اور 4 جی آ جانے کے بعد اُن بے چاروں کی مجبوریاں کس حد تک بڑھ جائیں گی کیونکہ وہ بے چارے سگی بیوی کے ساتھ ناشتہ کرتے ہوئے بھی سوتیلی بیوی کو اپنے موبائل کی بڑی اسکرین پر بذریعہ اسکائپ کہہ رہے ہونگے " جان میں پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں ناشتہ بنالو"۔

دونوں کو خوش کرکے اور جلد واپسی کے وعدے کرکے گاڑی میں دفتر جاتے ہوئے اُسی
پر کہہ (Whatsapp) "موبائل فون کی اسکرین پر اپنی آفس سیکریٹری سے "واٹس ایپ
رہے ہونگے " جان ! بس میں پہنچا جو بھی فون آئے کہنا صاحب میٹنگ میں مصروف
ہیں۔ سگنل کی بتّی سرخ ہو جانے کی وجہ سے بوریت کو دور کرنے کے لئے فوراً ہی اُسی
اسکرین پر "یو ٹیوب" لگا کر اپنی پسند کی وڈیو دیکھنے لگیں گے اور سگنل کھلنے پر نہایت پھرتی
کے ساتھ ڈرائیونگ کا کمال کرتے ہوئے کچھ ہی دور جا
کر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اُن کی اپنی وڈیو بن رہی ہو گی۔ اللہ بہتر کریگا۔

ہم بھی عجب کنفیوز قوم ہیں

یا تو ہمیں اپنی اپنی سیاست کی دوکان چلانی ہے یا پھر ہم واقعی ایک کنفیوز قوم ہیں۔ میرا نواز شریف کیا کسی سیاست دان سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ جس لمحے جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب کو پھانسی ہوئی اُسی لمحے میری سیاسی سوچ کا جنازہ نکل گیا تھااور دنیاکے اسلامی اُفق سے اُبھرتا ہؤا سورج غروب ہونے کے ساتھ میری تمام اُمیدیں اُن اندھیروں میں دفن ہو گئی تھیں جن کے منحوس سائے آج تمام عالمِ اسلام پر چھائے ہوئے ہیں اور جن کی وجہ سے دنیا کی تیسری بڑی قوت بننے کی بجائے دنیا کی سب سے بڑی دہشت گردی کی علامت بن چکے ہیں جبکہ ہم کہنے کو محمدؐ کے پیروکار ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ سنّتِ الٰہی پر عمل کرنا یا نہ کرنا ہمارااور اللہ کا معاملہ کہہ کر فرار اختیار کرتے ہیں اور سنّتِ رسول پر عمل کرنے میں شرم محسوس کرتے ہیں یعنی کوئی ہم سے لڑنے کے لئے ہمہ وقت تیار ہو تو ہم اپنے کردار اور اپنی گفتگو سے اُس کو ٹھنڈا کرنے کی بجائے اپنی انا کا مسئلہ بنا کر قتل و غارت کی نوبت تک معاملہ پہنچا دیتے ہیں اور یوں ہمارا یہ انفرادی رویّہ پوری قوم اور بین القوامی سطح پر امّتِ مسلمہ کی عکاسی کرتا ہے۔ ہم یہ قطعی طور پر بھول جاتے ہیں کہ ہر چھوٹی سی چھوٹی لڑائی سے لیکر بڑی سے بڑی جنگ تک مارا ہر حال میں غریب ہی جاتا ہے۔ حکمراں اور

امراء تو اپنی کئی نسلوں کا بیمہ پہلے ہی کرا چکے ہوتے ہیں۔
نریندر مودی کی حلف برداری کی تقریب میں ہمارے وزیرِ اعظم چلے گئے، غلط کیا اور نہ جاتے تو اور بھی غلط ہوتا۔ ون آن ون ملاقات میں نریندر مودی کا پانچ نکاتی ایجنڈا وصول کرلیا، غلط کیا اور منہ پر دے مارتے تو اور بھی غلط ہوتا۔ ہمیں کسی طرح چین نہیں اور یہ ہی وجہ ہے کہ ہم نے ایٹم بم تو کنفیوژن میں بنا لیا لیکن اب اس کو سنبھالنا مشکل ہو گیا ہے۔ کوئی قائدِ اعظم کے اُصولوں پر چلنے کے مشورے دیتا ہے تو کوئی مہاتما گاندھی کی پالیسی پر، ارے بھائی یا تو مذہب سے لاتعلقی کا اعلان کرو اور سب انسان ہو جاؤ یا پھر اپنے اپنے مذہبی رہنما کے صحیح پیروکار بنو۔ ہمارے وزیرِ اعظم نے اپنی انا ایک طرف رکھ کر تقریبِ حلف برداری میں شرکت کا فیصلہ کیا، لڑائی جھگڑے اور جنگ پر آمادہ مودی صاحب کو ٹھنڈا کرنے کی پالیسی اپنائی تو کیا ساری دنیا یہ نہ کہے گی کہ پاکستان نے ایک امن پسند ملک ہونے کا ثبوت دیا اور دنیا نہ بھی کہے دنیا کے سب سے پہلے نمبر کی با اثر شخصیت محمد کی تعلیمات تو یہی ہیں ان کے پیروکار نہیں عمل کریں گے تو کون کریگا؟ کبھی نتیجہ اللہ پہ بھی چھوڑ کر دیکھنا چاہئے لیکن عملِ صالح کے بعد۔
قارئین یقیناً یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ یا تو لکھنے والا "ن" لیگی ہے یا اس

نے پیسہ پکڑ لیا کیونکہ ریٹائرڈ بھی ہے۔ ان کو معلوم نہیں کہ میں خود سوچ رہا ہوں کہ ہمارے وزیر اعظم کو اتنا مثبت و اچھا مشورہ کس نے دے دیا اور میں نے ان کے اس عمل کی حمایت کیسے کر دی جبکہ بھٹو صاحب کے بعد کوئی سیاستدان تو کجا مجھے تو کوئی شخص بھایا ہی نہیں آج تک، ان کی پالیسیاں تو تبصرے کے لائق بھی نہیں۔

14 اگست 2014

آج 30 مئی 2014 صبح کے چار بجے مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آنے والی 14 اگست کو 16 دسمبر 1971 کا بد نصیب لمحہ آنے والا ہے۔ یقیناً قارئین کا پہلا ردِّ عمل یہ ہوگا کہ یا تو میرا دماغ چل گیا ہے یا پھر میں کسی کا ایجنٹ ہوں کیونکہ دل و دماغ ایسا ماننا تو دور کی بات، سوچنے کا بھی تصوّر کرنے کو تیار نہیں اور ہونا بھی نہیں چاہیئے لیکن جب مشرقی پاکستان ہماری مٹھی میں برف کی طرح پگھل رہا تھا اس وقت بھی ہم حقیقت سے روگردانی کرتے رہے۔ آج بھی میں صرف اپیل کر سکتا ہوں کہ کچھ کریں لیکن کس سے کہوں سارے کے سارے ادارے اور پوری سول سوسائٹی سب ہی تو محبِّ وطن ہیں لیکن بکاؤ مال بھی اسی معاشرہ کا حصہ ہے کس پہ شک کروں؟

Today May 30, 2014 at 4 A.M, there is a feeling that the same unfortunate moment of Dec. 16, 1971 will be replayed on coming 14th.Aug. Readers' instant reaction to my statement would be that either I am gone mad or playing in some hands because the core of our hearts will never be willing to accept it as it behaved at that moment when East Pakistan was melting in our palm and our brain was unable to think even about it. Now I appeal today to do something for God sake but to whom should I

appeal as all our Institutions and Civil Society is patriot without an atom of doubt BUT the number of black sheep is increasing day by day, so it is quite difficult to single out.

اوپر لکھے ہوئے خدشات کی بنیاد تمام اداروں اور سول سوسائٹی کی پچھلے کئی سالوں کی حرکات و سکنات ہے جو ہم سب جانے یا انجانے میں کر رہے ہیں جیسا کہ 70 کی دہائی میں کیا تھا اور آج تک طے نہ ہو سکا کہ اصل مجرم کون تھا بالکل اُسی طرح ہر کوئی حصہ بقدر جثہ اپنا اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ ان میں سے بیشتر تو سمجھتے ہیں کہ وہ تو حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہیں اور اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں اصل میں ان میں اتنی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ صحیح اور غلط میں تمیز کر سکیں اور کیوں کریں جبکہ ان کو منتخب کرنے والے ہی یہ تمیز نہیں رکھتے۔ مزید یہ کہ ایسا وقت ان قوموں پر ضرور آتا ہے جو خود جان بوجھ کر اپنی تباہی کا سامان اپنی ذاتی انا و خود غرضی کے مکروہ مقصد کے لئے کر رہی ہوتی ہیں۔

گھر گھر کی کہانی

گو کہ پوری دنیا میں اذیت پسند لوگ پائے جاتے ہیں جن کو نہ صرف اپنے آپ کو تکلیف پہنچا کر راحت محسوس ہوتی ہے بلکہ دوسروں کو کسی بھی قسم کی اذیّت پہنچا کر سکون ملتا ہے لیکن برّ صغیر کی عجب تاریخ ہے لگ بھگ سو سال پہلے تو ایسی فلمیں جنھیں دیکھ کر عوام زار و قطار روتے ہوئے باہر نہ نکلیں تو پیسے وصول ہی نہیں ہوتے تھے۔ ہر شے کی حد اور عروج و زوال بھی ایک فطری امر ہے لہٰذا تبدیلی کے لیئے رفتہ رفتہ طنز و مزاح کی آمیزش گذشتہ پانچ دھائیوں سے وقوع پذیر ہوئی لیکن ایک عنصر ہمیشہ ہی غالب رہا جو تھا رومانس کا جس کے بغیر کائنات کا نظام ہی نہیں چل سکتا۔

اذیّت پسندوں نے اپنی فطرت کی مجبوری کے تحت رومانس و طنز و مزاح کے ساتھ اپنی اس خصلت کو بھی شامل کرکے ایک مرتبہ پھر اپنے دل کی تسکین کی خاطر کہیں تشدّد تو کہیں غمِ فراق کی آمیزش کرکے فتح حاصل کر لی اور لگ بھگ گذشتہ پانچ دھائیوں سے نہ صرف سنیما گھروں بلکہ ہمارے کمروں کے اندر گھس کر معاشرے کی جو تباہی مچائی ہے، یہ میرے اس مضمون کا نچوڑ ہے۔ انڈین ڈرامے ہوں یا پاکستانی، نہایت ہی رومانوی انداز میں کہانی شروع ہوتی ہے خوب طنز و

مزاح بھی ہوتا ہے، نہایت فرحت بخش مقامات کا انتخاب کرکے وہاں گیتوں کی بارش بھی ہوتی ہے، حد تو یہ ہے کہ وقت کے خوبصورت ترین مرکزی کرداروں کی شادی ایک شاندار شاہانہ انداز میں منعقد ہونے میں پہلے زمانے کی طرح کوئی رکاوٹ بھی پیش نہیں آتی اور اس شاہانہ انداز کی شادی میں دونوں اطراف سے کوئی مقروض بھی نہیں ہوتا خواہ ابتدا میں کتنے بھی غریب ہی کیوں نہ ہوں۔انتہا تو یہ ہے کہ نہایت خوبصورت اولاد بھی ہو جاتی ہے لیکن ہم سب سمجھتے ہیں کہ اتنی آسانی سے جان چھوٹ گئی تو اذیّت پسند مافیا فلم یا ڈرامہ بنانے والی پوری ٹیم کو صفحہ ہستی سے مٹا دیگا اور ہم تبصرہ کے بھی قابل نہیں رہیں گے۔لہٰذا کہانی میں "ٹوسٹ" آتا ہے اور اچانک یا تو ایک عام سا نوجوان یا ایک معمولی شکل کی حسینہ کی انٹری ہوتی ہے نوجوان ہیروئین کا یا حسینہ ہیرو کی بچپن سے تلاش میں خوار ہانپتی کانپتی اسقدر قوت سے سینے سے ٹکراتے ہیں کہ آس پاس کے پہاڑ و وادیاں تھر تھرا جاتی ہیں، ننھے بچوں پر بجلی سی کڑکتی ہے اور بس عوام پر سکتا سا طاری ہو جاتا ہے حالانکہ شروع سے ہی سب کو اسی لمحے کا انتظار ہوتا ہے کیونکہ اب تو پورا معاشرہ ہی پیشہ ور اذیّت پسند ہو گیا ہے۔ نتیجتاً بے شمار ہنستے بستے گھرانے غموں کے ڈھیر میں تبدیل ہو رہے ہیں اور یہ محض برِّ صغیر میں ساٹھ سے پینسٹھ فیصد تک ہو رہا ہے۔ترقی یافتہ ممالک میں ایک فیصد بھی ایسا نہیں ہوتا کیونکہ وہاں سمدھیانے نہیں ہوتے جو بچپن کے نوجوان یا خوبرو حسینائیں ڈھونڈ کر

کہانی میں اپنا مصالحہ ڈالیں۔

زمین ایک ہارڈ ڈسک ہے

ذہن میں سوال آتا ہے کہ ایک روز کائنات کی تمام مخلوق خالقِ کائنات کے سامنے اپنی تمام زندگی کے کرتوت بیان کرے گی اور اگر اس میں کمی بیشی یا جھوٹ ہوگا تو کیسے پکڑا جائیگا۔ پوری کائنات بے شمار ہارڈ ڈسکز میں بٹی ہوئی ہے اور زمین ان میں سے ایک ہارڈ ڈسک ہے اس میں مقناطیسی فیلڈ ہے اور اس کے نارتھ اور ساؤتھ پولز بھی ہیں جیسے پوری کائنات میں ہیں۔ خالقِ کائنات عظیم ترین سائنسدان ہے، کائنات کا وجود سائنسی بنیادوں پر قائم ہے۔ تمام مخلوق کے کرتوت ہارڈ ڈسک پر اس کے فولڈر میں محفوظ ہوتے رہتے ہیں اور ایڈمنسٹریٹر کے اختیارات کے تحت خالق کوئی بھی فولڈر کھول کر اپنی کائنات کی سب سے بڑی ٹرانسپیرنٹ سکرین پر دکھا سکتا ہے خواہ وہ کسی بھی فارمیٹ میں ہو یعنی ڈاکومنٹ، تصویریں یا وڈیوز۔ اس طرح ہم جو زمین پر بسنے والے انسان ہیں جو کچھ اس طرح سے ہیں :

8000 BCتک پانچ ملین انسان تھے، دنیا کی موجودہ آبادی سات بلین ہے جبکہ لائیو سائنس اسٹاف کے مطابق سات فروری دو ہزار بارہ تک ایک سو سات بلین انسان اس دنیا میں آئے۔ ان کے ڈیٹا کے لئے کیا یہ ہارڈ ڈسک چھوٹی ہے؟

ان کے ڈیٹا کے لئے کیا یہ ہارڈ ڈسک چھوٹی ہے؟

:اب میں دنیا کی مقدس کتابوں میں سے ایک کتاب کے کچھ حوالے پیش کرتا ہوں

انسان کو اس دنیا میں عقل اور ارادہ و اختیار کی قوت اس لیے دی گئی ہے تاکہ اس کی :آزمائش کی جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے

جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم لوگوں کو آزمائے کہ تم میں کون بہتر'' عمل کرنے والا ہے۔'' الملک ۶۷: ۲

اُس کے سامنے زندگی گزارنے کے دو راستے ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور دوسرا نافرمانی کا راستہ ہے۔

اس امتحان میں صراطِ مستقیم کی راہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف طریقے اپنائے ہیں۔ :جن میں سے تین اہم ہیں

۱۔ ہر انسان کو عقل و شعور سے نواز اور قرآن حکیم کا یہ دعویٰ ہے کہ ہر انسان کے شعور میں یہ حقیقت اچھی طرح بٹھا دی گئی ہے کہ یہ کائنات بے خدا نہیں بلکہ اس کا پیدا کرنے والا، پالنے والا اور اس کا انتظام چلانے والا موجود ہے۔ اسی لیے انسان ہمیشہ توحید کے سوال سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ بڑے سے بڑا ملحد بھی کسی نہ کسی موقع پر اپنے دل میں پروردگار کے وجود کی گواہی ضرور دیتا ہے۔ اسی طرح بڑے سے بڑا مشرک بھی بسا اوقات یہ سمجھ لیتا ہے کہ مسبّب الاسباب صرف ایک ہی ذات ہے باقی کسی کی کوئی حیثیت نہیں۔ پھر اس کے ساتھ اُس کے ارد گرد بے شمار ایسی نشانیاں پھیلا دی گئی ہیں جن پر معمولی سا

غور و فکر کرکے بھی وہ اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ عظیم کارخانہ خود بخود وجود میں نہیں آ سکتا۔

۲۔ دوسری حیرت انگیز چیز ہر انسان کے قلب میں موجود ہے۔ جب بھی انسان غلط کام کرتا ہے تو اس کے قلب کے اندر سے آواز اسی ٹوکتی ہے کہ تم نے یہ اچھا نہیں کیا اور انسان کو ندامت محسوس ہوتی ہے۔ اسے ہم 'ضمیر' کہتے ہیں اور قرآن اسے 'نفسِ لوامہ' کہتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اس لیے انسان کو دیا گیا ہے تاکہ وہ اچھے اور برے میں فرق محسوس کر سکے۔

۳۔ انبیا اور ان کے ذریعے کتب بھیجیں۔ ان میں سے آخری کتاب قرآن حکیم زندہ معجزہ اپنی اصل شکل میں قیامت تک راہنمائی کے لیے موجود ہے۔

ضمیر کی صورت میں گویا قیامت کی عدالت کا عکس ہر انسان کے اندر موجود ہے۔ اگر قیامت نہ ہو تو پھر ضمیر کا وجود بے معنی تھا۔ یہی ضمیر انسان کو ہر وقت یہ احساس دلاتا رہتا ہے کہ نیکی و بدی برابر نہیں ہیں اس لیے نتیجے کے اعتبار سے بھی انھیں برابر نہیں ہونا چاہیے۔

قیامت کے دِن کے گواہ

زمین کی گواہی "ہر بندہ اور بندی کے متعلق شہادت دے گی کہ اس نے فلاں دن میرے
اوپر فلاں کام کیا تھا۔"

خالقِ کائنات کا پہلا سبق

آجکل کتاب پڑھنے کا ہمارے پاس بالکل وقت نہیں۔ کالم، آرٹیکل یا مقالہ پڑھنے میں مادری زبان یا مشکل الفاظ کی وجہ سے ان کے معنیٰ یا تشریح میں بھی وقت لگ جاتا ہے۔ پوسٹ مین کی طرح ایک جانب سے آئی ڈاک ایک ہی لمحے میں بہت سے لوگوں کو بھیجنا، لائک یا پسند کرنے کے لئے ایک کلک کرنا پڑتا ہے لیکن اس میں بھی تصویر یا وڈیو ہو تو توجہ طلب ہوتی ہے خواہ وڈیو پوری دیکھنے کا وقت نہ بھی ہو۔ سب سے کم وقت ٹویٹ میں درکار ہوتا ہے لیکن اس میں بھی تصویر کے بغیر دلچسپی کم کم ہوتی ہے۔ اسی تمہید کی بنیاد پر میں نے اپنی تصویر لگائی ہے ورنہ موضوع کے لحاظ سے کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ تصویر بھی ڈھونڈ کر ایسی نکالی تاکہ محض "لائک" نہ کی جائے بلکہ وقت نکال کر اس پر اعتراضات کی بھرمار ہو۔ کوئی کہے اتنی خوفناک مونچھیں، ڈاڑھی اور "Dislike" ہی رکھ لیتا یہ کوئی اسلامی حلیہ ہے۔ افسوس سوشل ویب سائٹس پر کا آپشن نہیں۔ لہٰذا میرا اصل موضوع ہے "اختلاف اور اس کا ردِّ "Un-favorite" عمل"۔ تاریخ کے مطابق فرشتوں کے سردار نے خالقِ کائنات سے اختلاف کرتے ہوئے آدم کے سامنے جھکنے سے اختلاف کیا وہ اپنے اختیارات کے تحت اس کو ہٹا کر نمبر دو کو سردار بنا سکتا تھا یا اس کو نیست و نابود کر سکتا تھا لیکن اس نے اس نافرمانی کو برداشت کیا اور یہ تھا آدم کے لئے پہلا سبق۔

اگر اس پہلے سبق پر عمل کیا ہوتا تو آج جو بنی نوع انسان کا حشر ہے یہ نہ ہوتا۔ برداشت کی حد ختم ہونے لگے تو صبر کی ابتدا ہوتی ہے، صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کو آئے تو شکر کا سہارا لینا پڑتا ہے لیکن یہ باتیں کہنا اور لکھنا آسان ہے کیونکہ میں ایک ادنی سا عام انسان ہوں۔ وہ انسان جو تھوڑی سی طاقت حاصل کر لیتے ہیں وہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" یعنی "Might is Right" کا فارمولہ استعمال کرتے ہوئے اپنا مقام اور فرائضِ منصبی بھول جاتے ہیں اور انھیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ قادرِ مطلق (Almighty) نے تو یہ نہیں کیا۔ خالقِ کائنات کی زمین پر زبردستی قبضہ کرکے اپنے ریاست بنا کر اپنی سلطنت قائم کرنا خواہ اس کے لئے جاپان پر ایٹم بم گرانا ہو، مغلوں کی طرح برِ صغیر پر حملے کرنا ہو، ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرح برِ صغیر پر تسلّط حاصل کرنا ہو یا مذہب کے نام پر اس کا حصّہ بقرہ کرنا ہو، فلسطینیوں کو مار بھگا کر اسرائیل کی بنیاد رکھنی ہو اور اب موجودہ دور میں مذہبی فرقہ پرستی کی بنیاد پر عرب دنیا اور پاکستان کا امن برباد کرنا ہو یہ سب کچھ اسی فارمولہ کی بنیاد پر ہو رہا ہے۔ نیّتوں میں فطور ہو تو بنی نوع انسان کی فلاح کی بجائے منافقانہ اقوامِ متحدہ، اسلامی ممالک کی تنظیم، کیمپ ڈیوڈ معاہدات، این آر او اور ایم ایف این وغیرہ جیسے ڈھکوسلے سامنے آتے ہیں اور موجودہ تباہی و بربادی سامنے آتی ہے۔